WWW.PAKSOCIETY.COM

شروع کی تھی۔ چنی کو پیدائش کے بعد زندگی میں پہلی بار پیٹ بھر کر خوراک اور اچھے صاف ستھرے کپڑے اور بس اس دن نصیب ہوا تھا جس دن اس کا خاندان قتل ہوا تھا۔ وہ چنی جس کو کبھی ماں باپ نے بھی غور سے نہیں دیکھا تھا اسے دیکھنے کے لیے پورا گاؤں امڈ آیا تھا اس کے دودھیالی اور ننھیالی خاندانوں کے سوا۔ جنہیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ وہ ذمہ داری انہیں کے گلے پڑ جائے۔ غربت اتنی بڑی لعنت ہوتی ہے کہ وہ انسان کے اندر سے خونی رشتوں کی محبت اور انسانیت کی بنیادی صفات بھی نکال دیتی ہے۔ چنی کے دودھیالی اور ننھیالی خاندانوں کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ وہ سب چھوٹی موٹی مزدوریاں کرتے اور بڑے بڑے خاندانوں کو پال رہے تھے۔ چھ' آٹھ بچوں والے خاندان میں ایک اور بچہ اور وہ بھی کسی دوسرے کا پالنا بہت مشکل تھا۔ وسائل اور آمدنی کے محدود ہونے کی وجہ سے۔

صرف غلام فرید کی ایک بہن تھی جس کے صرف چار بچے تھے۔ اور ان میں سے بھی تین بیٹے' تو دونوں خاندانوں کا دباؤ اسی پر پڑا تھا کہ چونکہ اس کی ذمہ داریاں کم ہیں اس لیے چنی کو وہی رکھے۔ صدمے اور غم سے بے حالی کی کیفیت میں وہ اپنے اکلوتے بھائی کے خاندان کی آخری نشانی کو اپنے پاس رکھنے پر تیار تو ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے شوہر اور سسرال والوں نے اس کا وہ صدمہ اس حادثے کے دوسرے ہی دن اپنے تیوروں اور ناراضی سے ختم کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی باقی رشتہ داروں کی طرح چنی کی ذمہ داری سے ہاتھ اٹھاتی۔ اس علاقے میں انتظامی عہدے داران اور سیاست دانوں اور سماجی شخصیات کی آمد شروع ہو گئی تھی اور جو بھی آرہا تھا وہ چنی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ساتھ کچھ نہ کچھ مالی امداد بھی کر کے جا رہا تھا۔

مالی امداد کے لیے دیے جانے والے چیکوں اور کیش رقومات کے سلسلے نے ایک دم چنی کے رشتہ داروں کے اندر صلہ رحمی اور خونی رشتوں کی چاہ جگا دی تھی۔ چنی بوجھ نہیں تھی بلکہ بوجھ بٹانے والی تھی اس کا اندازہ سب ہی کو ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی چنی کی کفالت کے لیے جھگڑوں کا آغاز بھی ہو گیا۔

دونوں سائیڈوں سے پورے کے پورے خاندان والے چنی کی دیکھ بھال کرنے والے اس ہمسائے کے گھر میں دھرنا دے کر بیٹھ گئے تھے۔ آپس میں گالم گلوچ اور مار کٹائی تک نوبت آنے پر ہمسائے کو پولیس کو طلب کرنا پڑا اور پولیس نے اس بچی کو اسی ہمسائے کی کفالت میں دیتے ہوئے فریقین سے کہا کہ وہ چنی کی کسٹڈی کے لیے عدالت سے رابطہ کریں اور جب تک عدالت کوئی فیصلہ نہیں کرتی' وہ بچی اسی گھر میں رہے گی۔

وہ چنی کی زندگی کے اچھے دنوں کا آغاز تھا۔ ہمسائے نے اگرچہ چنی پر وقتی طور پر رحم کھا کر ہی اس کی دیکھ بھال کا ذمہ اٹھایا تھا لیکن چنی کو ملنے والی چھوٹی بڑی نقد رقومات جیسے اس کے لیے لاٹری لگنے کے مصداق ہو گئی تھیں۔ چنی کو حکومتی ذرائع سے ملنے والے چیکس کو کیش کرانے پر تو عدالت نے اس کے رشتہ داروں کی طرف سے درج کرانے والے کیس کی وجہ سے حکم امتناعی دے کر روک دیا تھا مگر کیش رقومات کا حساب کتاب رکھنا اور ان پر کوئی پابندی مکمل طور پر لگانا ناممکن تھا۔

چنی کو اپنے پاس رکھنے والے ہمسائے نے اس کے لیے ملنے والی نقد رقومات کو چنی پر خرچ کرنے کے بہانے کھل کر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ وہ جیسے ایک بہتی گنگا تھی جس سے ہر کوئی ہاتھ دھو رہا تھا۔ اس رقم کے ثمرات چنی تک بھی خوراک' کپڑوں' کھلونوں اور طبی سہولیات کی شکل میں پہنچ رہے تھے مگر وہ بہت معمولی تھے ان ثمرات کے مقابلے میں جو اس ہمسائے کے خاندان کو ملنا شروع ہو گئے تھے۔

کیش رقوم کا وہ سلسلہ بہت جلد ہی ختم ہو گیا تھا۔ ایک ڈیڑھ مہینہ میں۔ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی ہمدردیاں ان کی یادداشت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی گئیں اور پھر ایک وقت آیا تھا جب چنی ہمسایوں کے لیے ایک بوجھ بن گئی تھی۔ سرکاری امداد کا وہ چیک جس کو استعمال کرنے پر فی الحال پابندی تھی اور وہ صرف اس کو مل سکتا تھا

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

جسے چنی کی کسٹڈی ملتی۔ اور چنی کی کسٹڈی رشتہ داروں ہی میں سے کسی کو ملنا تھی۔ ہمسائے کو نہیں۔ سو اس سے پہلے کہ عدالت کیس کا فیصلہ کرتی۔ ہمسائے چنی کے سب سے بڑے ماموں کو کچھ رقم کے عوض چنی تھما گئے تھے اور ساتھ انہوں نے عدالت میں یہ بیان بھی دے دیا تھا کہ چنی اسی ماموں کے گھر سب سے زیادہ اچھی پرورش پا سکتی تھی۔

تین مہینے کے بعد باقی تمام رشتہ داروں کی آہ و بکا کے باوجود چنی کا وہ ماموں چنی کی کسٹڈی اور دس لاکھ روپے کی رقم کا چیک عدالت سے حاصل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سونے کی چڑیا اب ماموں کے سر پر بیٹھ گئی تھی جو اس سے پہلے ایک' ریڑھا چلا کر پھل سبزیاں ادھر سے ادھر ڈھوتا تھا' دس لاکھ روپے سے اس نے فوری طور پر زمین کا ایک ٹکڑا خرید کر کاشت کاری کا آغاز کر دیا تھا۔ چنی اس کے گھر میں اس کے سات بچوں کے ساتھ احسان کے طور پر پلنے لگی تھی۔ مگر یہاں اس کی اس طرح کی ناز برداری نہیں کی گئی تھی جو وقتی طور پر ہی سہی لیکن اس ہمسائے نے کی تھی۔

ماموں کے بچوں نے پہلی بار زندگی میں اپنے باپ کے پاس اتنا پیسہ دیکھا تھا جس سے وہ انہیں وہ سب کچھ لے کر دے سکتا تھا جو پہلے ان کے لیے خواب اور حسرت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جیسے معجزاتی طور پر ان کی زندگی بدلی تھی' اور اس معجزے کا سہرا کوئی بھی چنی کے سر نہیں باندھ سکتا تھا۔ چنی اب ڈیڑھ سال کی ہو گئی تھی اور ایک بار پھر نہلانے دھلانے اور صاف کپڑوں کے ساتھ ساتھ وقت پر کھانے اور زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے ترسنا شروع ہو گئی تھی۔ مگر چنی کی صحیح خوش قسمتی کا آغاز اس دن ہوا تھا جب چنی کے خاندان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے تقریباً" چھ مہینے کے بعد اس اسکول کا مالک چنی کو دیکھنے آیا تھا جہاں غلام فرید کام کرتا رہا تھا اور جہاں سے ایک سزا کے طور پر نکالے جانے نے چنی سے اس کا خاندان چھین لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم سب آدم اور حوا کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ کسی عرب کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر' کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ برتری اگر ہے تو صرف تقویٰ کو۔ اور اپنے غلاموں کا خیال رکھو اور جو تم کھاؤ' اس میں سے ان کو کھلاؤ اور جو تم پہنو' اسی میں سے ان کو پہناؤ اور اگر وہ ایسی خطا کریں جو تم معاف نہ کرنا چاہو تو انہیں فروخت کر دو لیکن کوئی سزا نہ دو۔

☼ ☼ ☼

بیرونی گیٹ ہمیشہ کی طرح گھر میں کام کرنے والی میڈ نے کھولا تھا۔ ڈرائیو وے پر گاڑی کھڑی کرتے ہوئے سالار نے ابھی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ ہی کھولا تھا جب ہر روز کی طرح لان میں کھیلتے اس کے دونوں بچے بھاگتے ہوئے اس کے پاس آ گئے تھے۔ چار سالہ جبریل پہلے پہنچا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے بیٹے کا چہرہ چوما تھا۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔

"السلام علیکم!" گاڑی میں پڑے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر اس نے جبریل کا ماتھا اور چہرہ صاف کیا۔ جو اس نے بڑی فرماں برداری سے کروایا تھا۔ دو سالہ عنایہ تب تک ہانپتی کانپتی' شور مچاتی گرتی پڑتی اس کے پاس آ گئی تھی۔ دور سے پھیلے اس کے بازوؤں کو دیکھ کر وہ کچھ اور کھلکھلائی تھی۔

اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گود میں لیا تھا بہت زور سے اسے بھینچنے کے بعد اس نے باری باری بیٹی کے دونوں گال چومے تھے۔ جبریل تب تک کا ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ بند کر چکا تھا۔

اس نے عنایہ کو نیچے اتار دیا۔ وہ دونوں باپ سے ملنے کے بعد دوبارہ لان میں بھاگ گئے تھے جہاں وہ میڈ کی دو



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیٹیوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے۔ وہ چند لمحے ڈرائیو وے پر کھڑا اپنے بچوں کو دیکھتا رہا۔ پھر گاڑی کے پچھلے حصے سے اپنا بریف کیس اور جیکٹ نکالتے ہوئے وہ گھر کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

امامہ تب تک اس کے استقبال کے لیے دروازے تک آچکی تھی۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ وہ حیرانی سے اس کے پاس آتے ہوئے مسکرائی۔

"تم جلدی آگئے آج؟"

اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگاتے ہوئے اس کے بالوں کو ہولے سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں آج زیادہ کام نہیں تھا۔"

"تو ڈھونڈ لیتے۔" وہ جواباً" اس کے ہاتھ سے جیکٹ لیتے ہوئے ہنسی' وہ جواب دینے کے بجائے مسکرا دیا۔

اپنے بیڈ روم میں بیٹھے اس نے جب تک اپنا بریف کیس رکھا اور جوتے اتارے' وہ اس کے لیے پانی لے آئی تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے سے گلاس اٹھا رہا تھا جب امامہ نے اچانک پوچھا تھا۔ اس نے چونک اس کی شکل دیکھی۔

"ہاں بالکل۔ کیوں؟"

"نہیں' مجھے تھکے ہوئے لگے ہو' اس لیے پوچھ رہی ہوں۔" سالار نے جواب دینے کے بجائے گلاس منہ سے لگالیا۔ وہ ٹرے لے کر چلی گئی۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ سٹنگ ایریا میں آگیا تھا۔ لان میں اس کے دونوں بچے ابھی بھی اس فٹ بال کے پیچھے بھاگتے پھر رہے تھے۔ وہ سٹنگ ایریا کی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ کانگو کا موسم اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا اور اس کی وجہ وہ بارش تھی جو کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی اور جو شاید ابھی کچھ دیر میں پھر شروع ہونے والی تھی۔ کنشاسا میں پچھلے کئی دن سے ہر روز اسی وقت بارش ہوتی تھی۔ سہ پہر کے آخری چند گھنٹے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی بارش اور اس کے بعد مطلع صاف۔

"چائے۔" وہ امامہ کی آواز پر باہر لان میں دیکھتے بے اختیار پلٹا۔ وہ ایک ٹرے میں چائے کے دو مگ اور ایک پلیٹ میں چند بسکٹ لیے کھڑی تھی۔

"تھینکس۔" وہ مگ اور ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے مسکرایا۔

"باہر چلتے ہیں بچوں کے پاس۔" وہ باہر جاتے ہوئے بولی۔

"میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں' کسی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے باہر چلی گئی' چند منٹوں کے بعد اس نے امامہ کو لان میں نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ لان کے ایک کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھتے وہ کھڑکی میں اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ بھی جواباً" مسکرا دیا تھا۔

چائے کا مگ اور بسکٹوں کی پلیٹ اب لان میں اس کے سامنے پڑی ٹیبل پر رکھی تھی۔ اس نے باری باری جبریل اور عنایہ کو اس کے پاس آکر بسکٹ لیتے دیکھا۔ جبریل نے بسکٹ لے جا کر نونو اور لویا کو دیے تھے' چاروں بچے ایک بار پھر سے فٹ بال کھیلنے لگے تھے امامہ اب مکمل طور پر بچوں کی طرف متوجہ تھی۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے دائیں کندھے پر پڑی شال سے اپنے جسم کا وہ حصہ چھپائے جہاں ایک نئی زندگی پرورش پا رہی تھی (ان کے ہاں تیسرے بچے کی آمد متوقع تھی) وہ فٹ بال کے پیچھے بھاگتے بچوں کو دیکھتے ہوئے وقتاً فوقتاً ہنس رہی تھی اور پھر انہیں ہدایات دینے لگتی۔

سٹنگ ایریا کی کھڑکی کے سامنے کھڑے باہر دیکھتے ہوئے وہ جیسے ایک فلم دیکھ رہا تھا ایک مکمل فلم۔ اس کے

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہاتھ میں پکڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی' ایک گہرا سانس لے کر اس نے مگ پاس پڑی ٹیبل پر رکھ دیا۔

امامہ کا اندازہ "ٹھیک" تھا۔ وہ "ٹھیک" نہیں تھا۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے باہر لان میں نظر آنے والی ایک خوش حال فیملی کو دیکھ رہا تھا۔ آئیڈیل پرفیکٹ لائف کا ایک منظر' اس کے بچوں کے بچپن کے قیمتی لمحے۔ اپنے اندر ایک اور ننھا وجود لیے اس کی بیوی کا مطمئن و مسرور چہرہ۔

چند پیپرز کو پھاڑ کر پھینک دینے سے یہ زندگی ایسے ہی خوب صورت رہ سکتی تھی۔

وہ ایک لمحہ کے لیے بری طرح کمزور پڑا۔ اولاد اور بیوی واقعی انسان کی آزمائش ہوتے ہیں ان کے لیے جنہیں "مال" آزمانے سے قاصر رہتا ہے' انہیں دیکھتے ہوئے وہ بھی اسی آزمائش کا شکار ہو رہا تھا ایک مرد' ایک شوہر ایک باپ کے طور پر لان میں موجود اس کی فیملی اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ ان سے "خون" اور "محبت" کے رشتوں سے بندھا ہوا تھا۔

ایک لمحہ کے لیے اس کی نظر بھٹک کر جبریل اور عنایہ کے ساتھ کھیلنے والی چار اور چھ سال کی ان دو سیاہ فام لاغر بچیوں پر گئی تھی۔ اس کے خوب صورت گورے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ اور بھی زیادہ بدصورت لگ رہی تھیں۔ ہیڈی کی وہ دونوں بیٹیاں اگر اس وقت مناسب لباس اور جوتوں میں ملبوس تھیں تو اس کی وجہ ہیڈی کا ان کے گھر کام کرنا تھا۔ ورنہ وہ گومبے کے بدحالی کے شکار ہزاروں بچوں کی طرح اپنا بچپن کسی آسائش کے بغیر محنت مشقت کر کے گزار رہی ہوتیں۔ اور ان کے وہاں سے چلے جانے کے بعد ان کا مستقبل پھر کسی بے یقینی کا شکار ہو جاتا' بالکل اسی طرح جس طرح اس مغربی نو آبادی کے وہاں آجانے سے پورا افریقہ بے یقینی اور عدم استحکام کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ اسی مغربی نو آبادیات کے ایک نمائندے کے طور پر وہاں موجود تھا۔

اس نے اپنی تیس سالہ ملازمہ کو ڈرائیو وے پر کھڑے اپنی بچیوں کے کسی شاٹ پر تالیاں بجاتے دیکھا بالکل ویسے ہی جیسے لان کے ایک کونے میں کرسی پر بیٹھی اس کی بیوی اپنے دونوں بچوں کو کھیلتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ ہیڈی نے خود کبھی "بچپن" نہیں دیکھا تھا' وہ پیدا ہونے کے فوراً بعد "بالغ" ہو گئی تھی۔ افریقہ کے نوے فی صد بچوں کی طرح جنہیں "بچپن" یا "بقائے زندگی" میں سے کوئی ایک چیز ہی مل سکتی تھی۔

بچپن بہرحال ان آپشن میں سے تھا جو پریمیم کی لسٹ میں آتے تھے اور ایسا ہی ایک option اپنے بچوں کو دینے کے لیے ہیڈی سنگل پیرنٹ کے طور پر جان توڑ محنت کر رہی تھی۔ وہ ان کے ساتھ "انسانیت" کے رشتے میں منسلک تھا۔

ایک لمبے عرصہ کے بعد وہ پہلی بار وہاں کھڑا اپنی اولاد کا اس عورت کی اولاد سے موازنہ کر رہا تھا۔ اپنی بیوی کی زندگی اور اس عورت کی زندگی کا مقابلہ کر رہا تھا حالانکہ وہ آج وہاں اس کام کے لیے نہیں کھڑا تھا۔

اس کا فون بجنے لگا تھا۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے فون کرنے والے کی آئی دی دیکھی۔ کال ریسیو کرتے ہوئے اسے اندازہ تھا اس وقت دوسری طرف وہ کس سے بات کرنے والا تھا اسے اپنی فیملی کی زندگی اور استعفے میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"خوب سن لو۔ اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ پانچ وقت کی نماز قائم کرو۔ رمضان کے روزے رکھو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ خوشی سے ادا کرو۔ اپنے حاکم کی اطاعت کرو۔ چاہے وہ ایک ناک کٹا حبشی ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ اور اس طرح اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

عمیرہ احمد

# آب حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص — سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ جاتا ہے۔



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

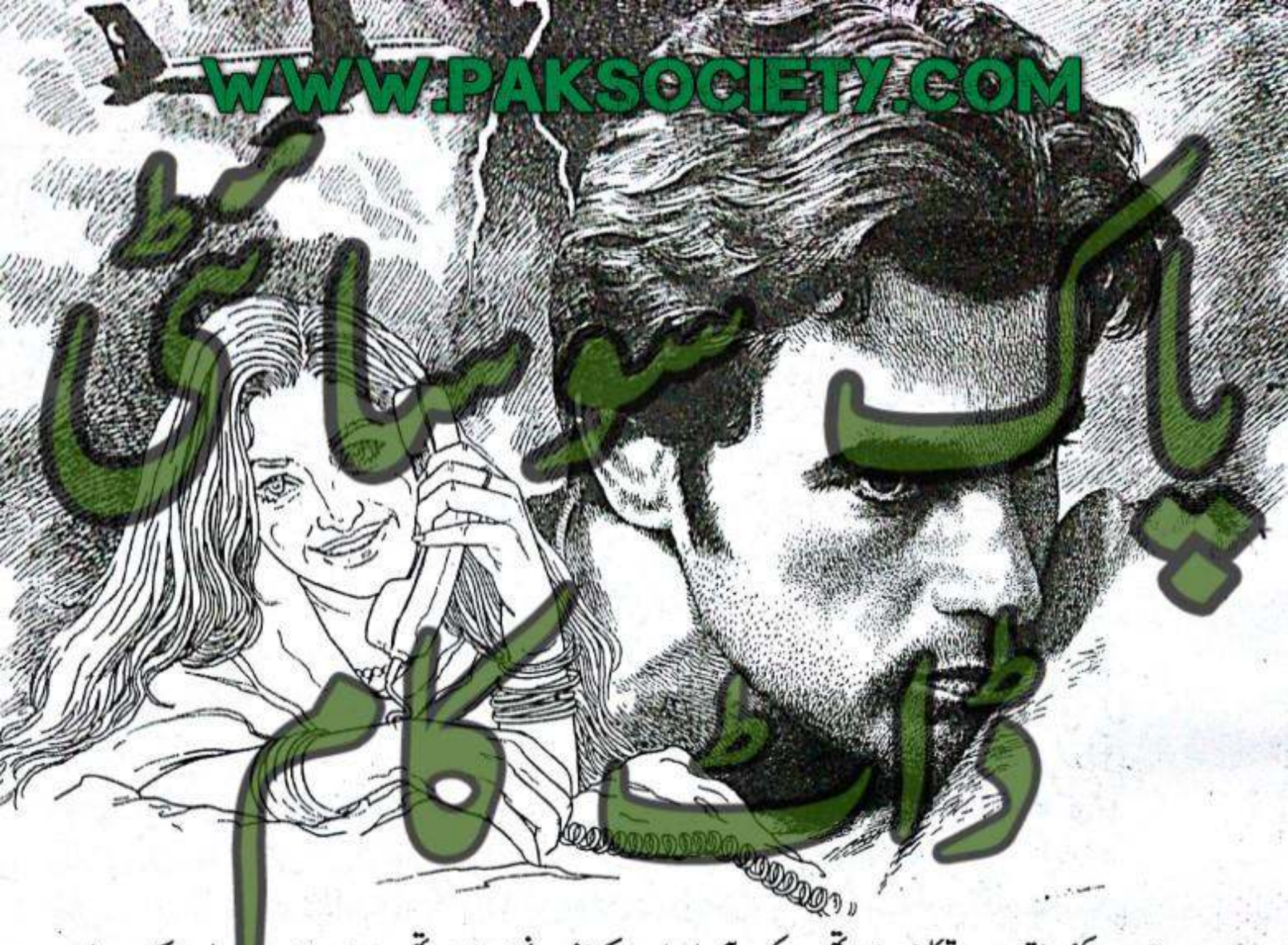

J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی، اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

نویں قسط



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

افریقہ کا دوسرا سب سے بڑا ملک کانگو پچھلی کئی دہائیوں سے دنیا میں صرف پانچ چیزوں کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ خانہ جنگی۔۔۔ جس میں اب تک 45 لاکھ لوگ جان گنوا چکے تھے۔۔۔ غربت کے لحاظ سے یو این کے اکنامک انڈیکیٹرز میں کانگو یو این کے 188 ممالک کی فہرست میں 187 ویں نمبر پر تھا۔ معدنی وسائل کے ذخائر کے لحاظ سے کانگو دنیا کا امیر ترین ملک تھا۔ گھنے جنگلات سے بھرا ہوا' جہاں پر کثرت سے بارشیں ہوتی تھیں۔ اور (Pygmy people) پستہ قامت' سیاہ فام لوگ کانگو کے ان جنگلات میں صدیوں سے پائے جانے والی انسانوں کی ایک ایسی نسل جو مہذب زمانے کے واحد غلام جنہیں غلام بنانا قانوناً" جائز تھا۔

اور یہ پہچان صرف کانگو کی نہیں تھی' افریقہ کے ہر ملک کی پہچان کم و بیش ایسی ہی چیزیں بن چکی ہیں۔ ایک چھٹی شناخت جو ان سب ملکوں میں مشترکہ ہے وہ مغربی استعماریت کی نئی شکل ہے۔۔۔ ورلڈ بینک۔۔۔ جو ان تمام ملکوں میں غربت کو ختم کرنے اور بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی کے لیبل کے نیچے ان تمام ممالک میں امریکا اور یورپی ممالک کو اپنی ملٹی نیشنل کمپنیز کے ذریعے افریقہ کے قدرتی اور معدنی وسائل کو' گنے کے رس کی طرح نچوڑنے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔۔۔ کانگو میں بھی یہی ہو رہا تھا اور پچھلی کئی دہائیوں سے ہو رہا تھا۔

1960 میں بیلجیم کی استعماریت سے نجات حاصل کرنے کے بعد کانگو نے تیس سال میں کم از کم بیس بار اپنا نام بدلا تھا۔۔۔ ساری جنگ نام رکھنے اور نام بدلنے کے بڑے مقصد کے حصول تک ہی محدود رہی اور بڑی عالمی طاقتوں امریکا اور فرانس کی پشت پناہی سے خانہ جنگی میں تبدیل ہوتی گئی۔۔۔ ایک ایسی ہولناک خانہ جنگی جس میں کانگو نے اپنی آزادی کے 55 سالوں میں تقریباً" 45 لاکھ لوگوں کی جان گنوائی۔۔۔ ساڑھے چھ کروڑ کی آبادی والے اس ملک میں کوئی گھر اور خاندان ایسا نہیں بچا جو اس خانہ جنگی سے متاثر نہ ہوا ہو' جس کے کسی فرد نے اس قتل و غارت میں جان نہ گنوائی ہو یا جسم کا کوئی حصہ نہ کھو بیٹھا ہو' یا جس کے خاندان کی عورتوں کی عزت پامال نہ ہوئی ہو' جس کے بچے اور بچیاں جنسی زیادتیوں کا شکار نہ ہوئی ہوں' یا چائلڈ سولجر کے طور پر متحارب گروپس کے ہاتھوں ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہ ہوئے ہوں۔ یہ دنیا کی مہذب تاریخ کی وہ پہلی خانہ جنگی تھی جس میں ایک دوسرے سے لڑنے والے قبیلے' لڑائی کے دوران انسانوں کو قتل کرتے اور ان کا گوشت خوراک کے متبادل کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ خانہ جنگی' دریائے کانگو کے گرد بسنے والے اس ملک کے لوگوں کا "کلچر" تھا۔۔۔ ایک ایسا "کلچر" جو مہذب دنیا کے مہذب لوگوں نے ان پر تھوپا تھا۔ خانہ جنگی کے ذریعے عالمی طاقتیں کانگو کی زمین اور معدنی وسائل پر قبضہ کر کے وہاں سے اربوں روپے کی معدنیات اپنے ملکوں اور اپنے معاشروں کی ترقی و فلاح و بہبود کے لیے لے جا رہی تھیں اور انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ افریقہ میں انسانیت کی تذلیل کس کس طرح سے کر رہے تھے اور اس کو فروغ دینے کا بھی ذریعہ بن رہے تھے۔

اگر 45 لاکھ لوگ خانہ جنگی کا شکار ہوئے تھے تو تقریباً" اتنی ہی تعداد بھوک' بیماری اور بنیادی انسانی ضروریات کی عدم فراہمی کی وجہ سے لقمہ اجل بن چکی تھی اور یہ سب کچھ اس ملک میں ہو رہا تھا جو معدنی وسائل کے ذخائر کے حساب سے دنیا کا سب سے امیر ترین ملک تھا۔ جس کی زمین کوبالٹ' پلاٹینم' یورینیم جیسی دنیا کی مہنگی ترین دھاتوں سے نہ صرف بھری ہوئی تھی بلکہ بہت ساری کمپنیز مقامی لوگوں کو خشک دودھ' مسالے اور کھانے پینے کی روزمرہ کی اشیا فراہم کر کر کے یہ ساری دھاتیں نکال بھی رہی تھیں۔

کانگو صرف ان دھاتوں سے مالا مال نہیں تھا بلکہ اس وقت دنیا بھر میں سب سے زیادہ خام ڈائمنڈ بھی پیدا کر رہا تھا' دنیا بھر میں دوسرا سب سے بڑا بارانی جنگلات رکھنے کا اعزاز بھی کانگو کو ہی حاصل تھا' جو نہ صرف اربوں ڈالرز کی قیمتی لکڑی کا مالک تھا' بلکہ ان ہی جنگلات سے دنیا بھر میں ربر بھی بھیجا جا رہا تھا۔

اور یہ سارے اعزازات کانگو کے سینے پر بالکل اسی طرح لگے ہوئے تھے جس طرح افریقہ کے کسی فوجی ڈکٹیٹر

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنرل کے سینے پر لٹکے ہوئے میڈلز اور رنگ برنگی پٹیوں کی قطار اور اس کے ہولسٹر میں لٹکا خالی ریوالور اور شاندار وردی کے ساتھ دنیا کے کسی بڑے ملک میں امداد کی بھیک کے لیے اس کا وہ دورہ جس میں ملنے والی زیادہ تر رقم اس کے بیرون ملک اکاؤنٹس میں ٹرانسفر ہو جاتی اور اس کے بدلے کانگو کی زمین کا سینہ کچھ اور خالی ہو جاتا۔

اور کانگو کی اسی زمین پر دنیا کے دوسرے بڑے بارانی جنگلات میں تقریباً" پانچ لاکھ کے قریب وہ خستہ حال آبادی رہتی تھی جو اپنی گزر بسر شکار کر کے کرتی تھی جن کے افراد آج بھی اپنے جسم درختوں کی چھالوں پتوں یا جانوروں کی کھالوں سے ڈھانپتے تھے یا پھر وہ برہنہ رہتے تھے۔ پانچ لاکھ کی وہ آبادی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں فرانس سے دوگنا رقبے پر پھیلے ہوئے ان بارانی جنگلات میں پھیلی ہوئی تھی اس لیے عددی اعتبار سے وہ کہیں بھی اس جنگلات کے قریبی آباد قصبوں میں آباد بانٹو قبیلے کے افراد پر غالب نہیں آسکتی تھی جو ہر لحاظ سے ان سے برتر تھے وہ کانگو کے آئینی اور قانونی شہری تھے جن کے پاس بنیادی حقوق بنیادی ضروریات کا سامان اور بہتر زندگی کے وسائل تھے۔

ان بے مایہ پست قامت کے پاس کچھ بھی نہیں تھا ان کے پاس صرف وہ جنگل تھا جس میں وہ رہتے تھے شکار کر کے پیٹ بھر لیتے تھے۔ تالابوں اور جھیلوں میں جمع بارش کے پانی سے پیاس بجھا لیتے تھے۔ درختوں کی لکڑیوں اور خشک پتوں سے جھونپڑیاں بنا کر چھت بنا لیتے تھے یا پھر گھنے درختوں پر مچان بنا کر رہ لیتے تھے۔ آپس میں شادیاں کر لیتے تھے اور ڈائریا ملیریا جیسی چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا شکار ہو کر مر جاتے۔۔۔ ان کی زندگی کا چکر بس یہیں تک تھا۔

جو لوگ زیادہ گھنے جنگلات کے بجائے قصبوں کے قریب جنگلات میں رہتے تھے۔ وہ بانٹو قبیلے کے افراد کے غلاموں کے طور پر جنگل میں کام کرتے۔۔۔ ان کے لیے لکڑی کاٹتے شکار کرتے کان کنی کر کے مختلف قسم کی دھاتیں بانٹو قبیلے کے اپنے مالکوں کو پہنچاتے جو ان کے لیے بے کار تھیں اور بدلے میں ان کے مالک انہیں روٹی کپڑا اور ضروریات کی وہ چھوٹی موٹی چیزیں دیتے تھے جو ان لوگوں کے لیے ضرورت سے زیادہ حیرت اور فخر کا باعث ہوتیں۔۔۔ انہیں دنیا سے جنگل کے علاوہ اور کچھ چاہیے بھی نہیں تھا لیکن دنیا کو جنگل نہیں چاہیے تھے۔

2002 میں کانگو کی قائم مقام حکومت نے کچھ عالمی طاقتوں کے دباؤ میں جنگلات سے لکڑی کی کٹائی کا ایک نیا قانون وضع کیا اور اس قانون کے تحت کانگو کی حکومت کے پاس یہ اختیار آگیا کہ وہ جنگلات میں رہنے والے قبیلوں اور آبادیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے اپنی مرضی سے جنگل کا کوئی بھی حصہ کسی بھی طریقے سے استعمال کر سکتی تھی۔ ورلڈ بینک اور دوسرے بین الاقوامی مالیاتی اداروں نے نہ صرف اس فریم ورک کو سپورٹ کیا بلکہ کانگو کی حکومت کو مالی وسائل فراہم کیے تاکہ کانگو کے جنگلات کو مختلف زونز میں تقسیم کر کے نشان دہی کی جائے کہ کس زون میں درخت کاٹے جائیں گے اور کس حصے کو صنعتی مقاصد کے لیے جنگلی حیات کی بقا کے لیے استعمال کیا جائے گا اور نیشنل پارک کی صورت میں تبدیل کر کے انسانی رہائش کے لیے ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔ ورلڈ بینک نے یو این کی خوراک کے عالمی ادارے کے ساتھ مل کر کانگو میں ان جنگلات کی تباہی کے ایک "عظیم الشان" پروجیکٹ کا آغاز کر دیا تھا۔

سالار سکندر جس وقت اس پروجیکٹ کے ہیڈ کے طور پر کانگو پہنچا تب تک اس منصوبے کو تین سال ہو چکے تھے۔ سالار سکندر کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ ورلڈ بینک اسے کس طرح استعمال کرنے والا تھا لیکن اسے یہ اندازہ بہت جلد ہو گیا تھا۔۔۔ ایباکا سے پہلی ملاقات کے بعد۔۔۔

☼ ☼ ☼

پیٹرس ایباکا سے سالار سکندر کی پہلی ملاقات بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ اسے کانگو میں آئے تقریباً"

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک سال ہونے والا تھا جب لاموکو نامی جگہ کو اپنی ٹیم کے ساتھ وزٹ کرتے ہوئے پیٹرس ایباکا تقریباً" دو درجن کے قریب Pygmies (پستہ قد لوگوں) کے ساتھ اچانک وہاں آگیا تھا جہاں سالار اور اس کی ٹیم کے لوگ اپنی گاڑیوں سے اتر کر اس علاقے کا جائزہ لے رہے تھے' جسے کچھ عرصہ پہلے ہی ایک یورپین ٹمبر کمپنی کو لیز پر دیا گیا تھا۔ ان کے پاس پرائیویٹ اور گورنمنٹ دونوں کی طرف سے دی جانے والی سیکورٹی موجود تھی اور ان گارڈز نے ایباکا اور اس کے گروپ کے لوگوں کو یک دم وہاں نمودار ہوتے دیکھ کر حواس باختگی کے عالم میں بے دریغ فائرنگ شروع کردی تھی۔

سالار نے دو پگمیز کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا اور باقیوں کو درختوں کی اوٹ میں چھپتے اور پھر بلند آواز میں ایباکا کو کسی درخت کی اوٹ سے انگریزی زبان میں یہ پکارتے سنا تھا کہ وہ حملہ کرنے نہیں آئے بات کرنے آئے ہیں۔ سالار اس وقت اپنی گاڑی کی اوٹ میں تھا اور اسی نے سب سے پہلے ایباکا کی پکار سنی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ حیران رہ گیا تھا کسی پگمیز کا انگریزی بولنا اس کے لیے یقیناً" حیران کن تھا' لیکن اس سے زیادہ حیران کن وہ امریکن لب و لہجہ تھا جس میں ایباکا چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ اسے ان سے بات کرنی ہے وہ صرف ملنا چاہتا ہے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا اور اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہیں۔

سالار کی ٹیم کے ساتھ موجود گارڈز اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے تب تک ٹیم کے تمام افراد کو گاڑیوں میں پہنچا چکے تھے ماسوائے سالار سکندر کے۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے گارڈز کی رہنمائی میں گاڑی میں سوار ہوتا اور پھر اس کی گاڑی بھی وہاں سے تیز رفتاری سے غائب ہو جاتی' سالار نے گارڈز سے وہاں کی مقامی زبان کنگالا میں کہا تھا' کہ وہ اس پکارنے والے آدمی سے بات کرنا چاہتا وہ فائرنگ بند کردیں' کیوں کہ یہ یک طرفہ ہے دوسری طرف سے نہ تو فائرنگ ہو رہی ہے نہ ہی کسی اور ہتھیار کا استعمال۔۔۔

اس کے گارڈز کچھ دیر تک اس سے بحث کرتے رہے اور اس بحث کو ختم کرنے کا واحد حل سالار نے وہ نکالا تھا جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی ثابت ہو سکتی تھی اگر دوسرا گروپ واقعی مسلح ہوتا۔۔۔ وہ یک دم زمین سے اٹھ کر گاڑی کی اوٹ سے باہر نکل آیا تھا اس کی سیکورٹی پر تعینات گارڈز ان پگمیز کے سامنے آنے پر اس طرح حواس باختہ نہیں ہوئے تھے جتنے اس کے اس طرح بالکل سامنے آجانے پر ہوئے تھے۔

سالار ان کی حواس باختگی سمجھ سکتا تھا۔ وہ پاکستان نہیں تھا' خانہ جنگی کا شکار کانگو تھا' جہاں کسی کی جان لینا مچھر مارنے کے برابر تھا اور یہ قتل و غارت کسی قانونی عدالت میں کسی کو کوئی سزا نہیں دلوا سکتی تھی۔ جب جان لے لینا اتنا آسان ہو تو کوئی بھی حواس باختہ ہو کر خوف کی حالت میں وہی کرتا ہے جو اس کے گارڈز کر رہے تھے۔ مار دینا بہر حال خود مر جانے سے زیادہ بہتر انتخاب تھا اور اس وقت وہ کچھ فاصلے پر دو پگمیز کی لاشیں دیکھ سکتا تھا اور وہ دور سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ زندہ نہیں تھے۔

فائرنگ اب تھم گئی تھی اس کی تقلید میں اس کی سیکورٹی کے افراد بھی باہر نکل آئے تھے وہاں اب صرف دو گاڑیاں تھیں ٹیم کے باقی سب افراد وہاں سے اپنے اپنے گارڈز کی حفاظت میں نکل چکے تھے۔

فائرنگ کے تھمتے ہی ایباکا بھی باہر نکل آیا تھا۔ سالار نے چلا کر اپنے گارڈز کو گولی چلانے سے منع کیا تھا پھر وہ اس ساڑھے چار فٹ قد کے بے حد سیاہ چپٹی ناک والے اور موٹی موٹی سیاہ آنکھوں والے آدمی کی طرف متوجہ ہوا' جو اپنے ساتھیوں کے برعکس جینز اور شرٹ میں تھا ان ننگے پاؤں والے پست قامت لوگوں کے درمیان جاگرز پہنے بے حد عجیب لگ رہا تھا۔

اسے اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ حملہ آور گروپس کے افراد نہیں تھے۔ ورلڈ بینک اور دوسرے بین الاقوامی مالیاتی ادارے اپنی ٹیمز کو ان جنگلات میں کہیں بھی بھیجنے سے پہلے اس گروپ سے اپنی ٹیم کے افراد کے تحفظ اور

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

سیکورٹی کی ضمانت لیتے تھے جو گروپ اس علاقے پر قابض ہوتا تھا اور اس کے بدلے وہ اس متحارب گروپ کو کچھ نہ کچھ مالی امداد فراہم کرتے تھے۔ اگرچہ وہ علاقہ جس میں سالار کی ٹیم گئی تھی' وہ خانہ جنگی سے متاثرہ علاقوں میں سے نہیں تھا اس کے باوجود اس ٹیم کے وزٹ کے لیے بھی تحفظ کی یقین دہانی کرائی گئی تھی اور اس کے باوجود یہ واقعہ ہو گیا تھا۔

"پیٹرس ایباکا!" اس پست قامت شخص نے آگے بڑھ کر تعارف کرواتے ہوئے سالار سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا جسے تھامنے سے پہلے سالار نے بڑے نپے تلے انداز میں ایباکا کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا تھا وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ بھی ان مفلوک حال لوگوں ہی کی طرح ہو گا جو غیر ملکیوں کی گاڑیاں سامنے آنے پر امداد کے لیے ان کے سامنے آجاتے تھے۔ مالی امداد نہ سہی' لیکن خشک خوراک کے ڈبے' دودھ' جوسز بھی ان کے لیے ایک عیاشی ہوتی۔ سالار بھی ایباکا سے ایسی ہی کسی ڈیمانڈ کا انتظار کر رہا تھا' لیکن جواباً" ایباکا کی زبان سے اپنا نام سن کر وہ حیران ہو گیا تھا۔

اس نے ایباکا سے اپنا تعارف نہیں کروایا تھا پھر بھی وہ اسے نام سے کیسے جانتا تھا۔ وہ ایباکا سے یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے جواباً" اسے بتایا کہ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ لوموکا میں ہونے والے وزٹ کے بارے میں بھی' اسے بینک کے آفس میں کام کرنے والے کسی مقامی آدمی نے بتایا تھا۔ جس نے ایباکا کی سرتوڑ کوشش کے باوجود سالار سے ملاقات کے لیے اپائنٹ منٹ کے حصول میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ چند دنوں یا چند ہفتوں کی بات نہیں تھی۔ ایباکا ورلڈ بینک کے کنٹری ہیڈ سے ملاقات کے لیے کئی مہینوں سے کوشش کر رہا تھا۔ وہ سالار کے آفس نمبرز پر ہر روز ڈھیروں کالز کرتا رہتا تھا۔ ویب سائٹ پر موجود اس کے ای میل ایڈریس پر اس نے سینکڑوں ای میلز کی تھیں جن کا جواب ہر بار صرف موصولی ہی کا آیا تھا۔ اس کے بعد آگے کچھ نہیں.... فون کالز ریسیو کرنے والے سالار کے عملے کے افراد کے پاس بھی ایباکا کے لیے صرف ایک جواب تھا۔ وہ میٹنگ میں ہیں آپ کا پیغام پہنچا دیا جائے گا۔

ایباکا کی ملاقات کا مقصد جان کر اسے جواباً" ـــ بڑے نارمل انداز میں ٹالا جاتا۔ اس کی گفتگو سنتے ہوئے سالار اس کی زبان و بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اسے اب شبہ نہیں رہا تھا کہ بیلجیم کی کالونی ہونے کی وجہ سے جس ملک کی قومی زبان فرنچ ہو وہاں اس امریکن لب و لہجے میں انگریزی میں اتنی روانی سے بات کرنے والا جنگلات کا باسی ہونے کے باوجود بیرون ملک کا تعلیم یافتہ ہو گا۔

یہ ناقابل یقین بات تھی' لیکن اس کے بعد جو کچھ سالار سکندر نے سنا تھا' اس نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ پیٹرس ایباکا ہاورڈ بزنس اسکول کا گریجویٹ تھا اور وال اسٹریٹ میں جے پی مارگن گروپ کے ساتھ پانچ سال کام کرنے کے بعد کانگو آیا تھا۔

اپنے والٹ سے نکالے ہوئے کچھ وزیٹنگ کارڈز اس نے سالار سکندر کی طرف بڑھا دیے تھے اس نے بے حد بے یقینی سے انہیں پکڑا تھا۔ وہ فقیر پست قامت بے مایہ شخص تھا.... کانگو کے جنگلات میں تیروں' نیزوں اور پتھروں سے شکار کر کے پیٹ کی بھوک مٹانے والا ایک جنگلی.... وہ ہاورڈ کے کینڈی بزنس اسکول کہاں سے پہنچ گیا تھا اور پھر جے پی مارگن گروپ کے ساتھ منسلک رہنا.... تو پھر وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟

اور یہ وہ سوال تھا جس کا جواب پیٹرس ایباکا نے سالار سکندر کو اس کے آفس میں دوسرے دن' اپنی دوسری ملاقات میں کاغذات کے ایک انبار کے ساتھ دیا تھا' جو وہ اس ملاقات میں سالار سکندر کو دینے آیا تھا۔

پیٹرس ایباکا دس سال کی عمر میں لوموکا میں ایک بچہ کے طور پر ایک مشنری سے متعارف ہوا تھا' جو اسے اپنے ساتھ کانگو کے جنگلات میں وہاں کے لوگوں سے رابطہ اور کمیونی کیشن کے لیے ساتھ لے کر پھرتا رہا اور پھر اسے

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس حد تک اس بچے کے ساتھ لگاؤ ہو گیا کہ بیماری کی وجہ سے کانگو چھوڑنے پر وہ ایباکا کو بھی اپنے ساتھ امریکا لے گیا تھا جہاں اس نے اسے پیٹرس کا نام دیا۔ ایک نیا مذہب بھی... لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے ایباکا کو تعلیم دلوائی۔ تعلیم کے لیے خیرات سے فنڈنگ دلوائی۔ ایباکا بے حد ذہین تھا اور رپورٹ جانسن نے اس کی اس ذہانت کو جانچ لیا تھا' وہ ایباکا کو اس کے بعد ہر سال کانگو لاتا رہا جہاں ایباکا کا خاندان آج بھی اسی طرح جی رہا تھا۔ دس سالہ ایباکا نے اگلے پچیس سال امریکا میں گزارے تھے' مگر اس کے بعد وہ امریکا چھوڑ آیا تھا۔

وہ اپنے لوگوں کے پاس رہنا چاہتا تھا کیوں کہ انہیں اس کی ضرورت تھی اور انہیں اس کی ضرورت اس لیے تھی کیونکہ ورلڈ بینک کے مالی تعاون سے ہونے والے بہت سے منصوبوں میں سے ایک منصوبہ جنگل کے اس حصے میں شروع ہو گیا تھا جہاں ایباکا کا قبیلہ آباد تھا۔ اس کا خاندان اور خاندان سے بھی بڑھ کر وہ دس ہزار لوگ جو اب جنگل کے اس حصے سے بے دخل کیے جا رہے تھے جس میں وہ صدیوں سے رہ رہے تھے۔ جنگل کٹنے جا رہا تھا' وہ ساری زمین صاف ہوتی پھر اس کے بعد وہاں ان معدنیات کی تلاش شروع ہوتی جو اس منصوبے کا دوسرا حصہ تھا' اور ایباکا کا مسئلہ' اس کا اپنا خاندان نہیں تھا۔ ایباکا کا مسئلہ وہ پورا جنگلات کا حصہ تھا جو اب جگہ جگہ زونز بنا کر کاٹا جا رہا تھا اور کہیں نیشنل پارک بنا کر ان لوگوں کو وہاں سے بے دخل کیا جا رہا تھا۔

"ہم پانچ لاکھ لوگ ہیں مگر یہ جنگل تو کانگو کے ساڑھے تین کروڑ لوگوں کو روزگار دے رہا ہے۔ ورلڈ بینک ٹمبر انڈسٹری کو معاونت دے رہا ہے کیونکہ اس سے ہماری غربت ختم ہو گی۔ جب چند دہائیوں میں جنگل ہی غائب ہو کر یورپ اور امریکہ کی فیکٹریز اور شوروم میں مہنگے داموں بکنے والی لکڑی کی اشیاء میں تبدیل ہو جائیں گے تو کانگو کے لوگ کیا کریں گے۔ تم لوگ ہم سے وہ بھی چھیننا چاہتے ہو جو اللہ نے ہمیں دیا ہے۔ اگر کبھی ہم ویسٹ میں ان سے سب کچھ چھیننے پہنچ گئے تو تمہیں کیسا لگے گا؟" ایباکا نے اپنا کیس بہت تہذیب سی پیش کیا تھا مگر بات کے اختتام تک اس کی بے چینی اس کے لب و لہجہ سے جھلکنے لگی تھی۔

سالار سکندر کے پاس اس کے سوالوں کے رٹے رٹائے جوابات تھے۔ اس پروجیکٹ کی طرح کانگو میں ہونے والے اور بہت سے پراجیکٹس کی تفصیلات اس کی انگلیوں پر تھیں وہ وہاں ورلڈ بینک کا کنٹری ہیڈ تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ ان پروجیکٹس کی اہمیت اور فزیبلٹی رپورٹس کے بارے میں اسے پتا نہ ہوتا۔ مگر ایسا پہلی بار ہوا تھا' کہ پیٹرس ایباکا کے انکشافات اور سوالات اسے پریشان کرنے لگے تھے۔ بہت کچھ ایسا تھا جو اس کی ناک کے نیچے ہو رہا تھا اور اسے پتا نہیں تھا لیکن وہ اس سب کا حصہ دار تھا کیونکہ وہ سب کچھ اس کے دستخطوں کے ساتھ منظور ہو رہا تھا۔ کانگو میں وہ پہلی بار نہیں آیا تھا نہ ہی افریقہ اور اس کے مسائل اس کے لیے نئے تھے نہ ہی وہاں کے وسائل پر مغرب کی ٹپکتی ہوئی رال اس کے لیے کوئی پوشیدہ بات تھی لیکن وہ ہمیشہ یہ سمجھتا رہا تھا کہ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں اور کوئی بھی فلاحی کام کرنے والی بین الاقوامی مالیاتی تنظیم اپنے مفادات کو بالائے طاق رکھ کر' کسی ملک اور قوم کے لیے کچھ نہیں کر سکتی اور وہ انہیں اتنی چھوٹ دیتا تھا مگر ایباکا کے اعتراضات اور انکشافات نے اسے ہلا دیا تھا۔ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا' وہ ورلڈ بینک کے اپنے چارٹر کے خلاف تھا لیکن یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور ورلڈ بینک کی دلچسپی اور مرضی سے ہو رہا تھا۔

ایباکا کی دی ہوئی فائلوں کے انبار وہ کئی ہفتے پڑھتا رہا تھا۔ کئی ہفتے وہ اپنے آپ سے جنگ کرتا رہا تھا۔ ورلڈ بینک کے ایماء پر وہاں ایسی کمپنیوں کو لکڑی استعمال کرنے کی اجازت دی گئی تھی جن کا ٹریک ریکارڈ افریقہ کے دوسرے بہت سے ممالک میں اسی حوالے سے قابل اعتراض رہا تھا۔ لکڑی کٹ رہی تھی۔ جنگل صاف ہو رہا تھا۔ آبادی بے دخل ہو رہی تھی اور جن شرائط پر ان کمپنیز کو وہاں لائسنس دیا گیا تھا وہ کمپنیز ان شرائط کو بھی پورا نہیں کر رہی تھیں۔ انہیں لکڑی کے عوض اس علاقے کے لوگوں کی معاشی حالت سدھارنے کا فریضہ دیا گیا تھا اور وہ کمپنیاں

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

کروڑوں ڈالرز کی لکڑی لے جانے کے عوض چند عارضی نوعیت کے اسکولز اور ڈسپنسریز لوگوں کو فراہم کر رہی تھیں۔ خوراک۔ خشک دودھ نمک اور مسالاجات کی شکل میں دی جا رہی تھی۔

اور یہ سب ورلڈ بینک آفیشلز کے نگرانی کے باوجود ہو رہا تھا کیونکہ پگمیز کو اس ملک میں اچھوت کا درجہ حاصل تھا' وہ ان کمپنیز کے خلاف عدالت میں نہیں جاسکتے تھے۔ حکومتی عہدے داران کے پاس نہیں جاسکتے تھے۔ صرف ایک کام کرسکتے تھے۔ احتجاج۔ این جی اوز کے ذریعے یا پھر میڈیا کے ذریعے۔ اور یہ کام بہت مشکل تھا۔ وہ مہذب دنیا کا حصہ نہیں تھا جہاں پر کسی کے ساتھ ہونے والی زیادتی' چار گھنٹے میں ہر بڑے نیوز چینل کی ہیڈ لائن بن جاتی تھی۔ وہ افریقہ تھا جہاں پر ایسی زیادتی' تشدد کے ذریعے ہی دبادی جاتی تھی۔

اگلے دو ماہ سالار کو ایباکا کے ساتھ اور انفرادی حیثیت میں ان جگہوں کو خود جا کر دیکھنے میں لگے جن کے بارے میں ایباکا نے اسے دستاویزات دی تھیں۔ اور پھر اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دستاویزات اور ان میں پائی جانے والی معلومات بالکل ٹھیک تھیں۔ ضمیر کا فیصلہ بہت آسان تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ غلط تھا اور وہ اس کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا' لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اب کیا کرے۔ ایک استعفیٰ دے کر اس ساری صورت حال کو اسی طرح چھوڑ کر نکل جاتا۔ اور اسے یقین تھا ایسی صورت میں جو کچھ وہاں چل رہا تھا' وہ چلتا ہی رہتا۔ یا پھر وہ وہاں ہونے والی بے ضابطگیوں پر آواز بلند کرتا۔ بے ضابطگی ایک بہت چھوٹا لفظ تھا۔ جو کچھ ورلڈ بینک وہاں کر رہا تھا وہ اخلاقیات اور انسانیت کی دھجیاں اڑانے کے برابر تھا۔

افریقہ میں ایباکا سے ملنے کے بعد' زندگی میں پہلی بار سالار سکندر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کے ان الفاظ کو سمجھا تھا کہ "کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی سبقت حاصل نہیں۔" وہ ہمیشہ ان الفاظ کو صرف ذات' برادری اور اونچ نیچ کے حوالے سے دیکھتا رہا تھا۔ وہ پہلی دفعہ اس سیاہ فام آبادی کا حال اور استحصال دیکھ رہا تھا' جو دنیا کے ایک بڑے خطے پر بستی تھی۔ معدنیات اور قدرتی وسائل سے مالا مال خطہ۔ اور پھر اس گوری آبادی کی ذہنی پسماندگی' ہوس دیکھ رہا تھا جس کا وہ بھی حصہ تھا۔ اور اسے خوف محسوس ہوا تھا۔ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ' آنے والے زمانوں کے حوالے سے اسی خطے اور اسی سیاہ فام آبادی کے حوالے سے کوئی پیش گوئی تھی۔ یا کوئی تنبیہہ جسے صرف سفید فام لوگ ہی نہیں مسلمان بھی نظر انداز کیے ہوئے تھے۔ صدیوں پہلے غلامی کا جو طوق سیاہ فاموں کے گلے سے ہٹا لیا گیا تھا 21 ویں صدی کے مہذب زمانے میں افریقہ میں استعماریت نے وہ طوق ایک بار پھر ڈال دیا تھا۔

اور انہیں سیاہ فام پست قامت لوگوں میں سے ایک پیٹرس ایباکا تھا۔ جو امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں اپنی زندگی کے 25 سال گزارنے کے بعد بھی وہاں سے "اس سیاہ دور" میں لوٹ آیا تھا۔ صرف اپنے لوگوں کی "بقا" کے لیے۔ "بقا" کے لفظ کا مفہوم سالار سکندر نے پیٹرس ایباکا سے سیکھا تھا اور اس بقائے باہمی کے لیے کیا کیا قربان کیا جاسکتا تھا وہ بھی وہ ایباکا سے ہی سیکھ رہا تھا۔

زندگی میں اسے تقویٰ کا مطلب بھی اسی شخص نے سمجھایا تھا جو مسلمان نہیں تھا۔ وہ تقویٰ جس کا ذکر آخری خطبے میں تھا اور جس کو فضیلت حاصل تھی رنگ' نسل' ذات' پات ہر اس دنیاوی شے پر جسے برتر سمجھا جاتا تھا۔

پیٹرس ایباکا کو اللہ کا خوف تھا۔ لادین سے کیتھولک اور کیتھولک سے پھر لادین ہونے کے باوجود اللہ سے ڈرتا تھا۔ اسے مانتا تھا۔ اس کی عبادت بھی کرتا تھا اور اس سے مانگتا بھی تھا لیکن وہ یہ کام کسی گرجے' مندر یا مسجد میں نہیں کرتا تھا کانگو میں اپنے لوگوں کے ساتھ انسانیت سے گرا ہوا سلوک ہونے کے باوجود وہ انسانیت کا درد رکھتا تھا۔ ایمان دار تھا۔ اخلاقی برائیوں سے بچا ہوا تھا۔ مگر پیٹرس ایباکا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ترغیبات کو خدا خوفی کی وجہ سے چھوڑتا تھا۔ وہ نفس پرست نہیں تھا۔ وہ طمع زدہ بھی نہیں تھا اور سالار سکندر بہت

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

بار اسے سمجھ نہیں پاتا تھا۔ ایبا کا بلاشبہ غیر معمولی انسان تھا اور وہ اگر سالار سکندر کو متاثر کر رہا تھا تو وہ کسی بھی انسان کو کر سکتا تھا۔

وہ دنیا کے دو ذہین ترین انسانوں کا آمنا سامنا تھا یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک متاثر ہوتا دوسرا نہیں۔

"سالار سکندر! میں اپنی زندگی میں تم سے زیادہ قابل اور ذہین انسان سے نہیں ملا۔"

ایبا کا نے ایک مہینے کے بعد سالار کے ساتھ ہونے والی کئی ملاقاتوں کے بعد جیسے اس کے سامنے اعتراف کیا تھا۔ سالار صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

"میں خود انٹرنیشنل آرگنائزیشنز میں کام کر چکا ہوں اور ان میں کام کرنے والے بہت افراد سے ملتا بھی رہا ہوں لیکن تم ان سب میں مختلف ہو مجھے یقین ہے تم میری مدد کرو گے۔"

"تعریف کا شکریہ لیکن اگر تم اس خوشامد کا سہارا میری مدد کے لیے لے رہے ہو اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے منہ سے یہ سب سننے کے بعد آنکھیں بند کر کے تمہاری خاطر اس صلیب پر چڑھ جاؤں گا تو میرے بارے میں تمہارا اندازہ غلط ہے۔ میں جو بھی قدم اٹھاؤں گا' سوچ سمجھ کر اٹھاؤں گا۔

ایبا کا کی اس فیاضانہ تعریف کو خوشامد قرار دینے کے باوجود سالار جانتا تھا ایبا کا کو اس کی شکل میں اور اس پوزیشن پر واقعی ایک مسیحا مل گیا تھا۔ مسیحا بھی وہ جو ورلڈ بینک میں کام کرنے کے باوجود اپنا ضمیر زبردستی بے ہوش تو کر سکتا تھا' سلا نہیں سکتا تھا۔

"تمہارا سینس آف ہیومر بہت اچھا ہے" ایبا کا نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا تھا "یہ چیز مجھ میں نہیں پائی جاتی۔"

سالار نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "اور جس صورت حال میں تم مجھے ڈال بیٹھے ہو اس کے بعد تو اگلے کئی سالوں بھی اس کے پیدا ہونے کے کوئی امکانات نہیں۔"

"میں بہت سارے مسلمانوں کے ساتھ پڑھتا رہا ہوں' کام کرتا رہا ہوں' ملتا رہا ہوں مگر تم ان سے مختلف ہو۔"

وہ عجیب تبصرہ تھا یا کم از کم سالار کو لگا تھا۔

"میں کسی طرح مختلف ہوں؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"تم ایک اچھے مسلمان ہونے کے ساتھ اچھے انسان بھی ہو۔ جن سے میرا واسطہ پڑا' وہ یا اچھے مسلمان ہوتے تھے یا اچھے انسان۔"

سالار کچھ دیر تک بول نہیں سکا بولنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا تھا افریقہ کے اس بے دین انسان نے۔

"اچھا مسلمان تمہاری نظر میں کیا ہے؟" سالار نے بہت دیر خاموش رہنے کے بعد اس سے پوچھا تھا۔

تمہیں میری بات بری تو نہیں لگی؟ ایبا کا یک دم محتاط ہوا تھا۔

"نہیں۔ مجھے تمہاری بات انٹرسٹنگ لگی مگر تمہاری زبان سے ادا ہونے والا یہ پہلا جملہ تھا جس میں تمہاری کم علمی جھلکی۔"

اس بار ایبا کا الجھا۔ وہ مذہب ڈسکس کرنے کے لیے نہیں ملے تھے لیکن مذہب ڈسکس ہو رہا تھا۔ وہ مذہب پر بحث نہیں کرنا چاہتے تھے اور مذہب پر بحث ہو رہی تھی۔

"اچھا مسلمان۔؟ جو بہت Practising (باعمل) ہے۔ ساری عبادات کرتا ہے۔ پورک نہیں کھاتا۔ شراب نہیں پیتا۔ نائٹ کلب میں نہیں جاتا۔ میرے نزدیک وہ ایک اچھا مسلمان ہے جیسے ایک اچھا عیسائی یا ایک اچھا یہودی۔"

ایبا کا کو اندازہ نہیں تھا' وہ اپنی کم علمی میں بھی جو باتیں کہہ رہا تھا۔ وہ سالار سکندر کو شرمسار کرنے کے لیے کافی

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھیں۔ رنج اپنے لیے نہیں ہو رہا تھا اپنے مذہب کے پیروکاروں کے تعارف پر ہو رہا تھا۔ یعنی کوئی فرق ہی نہیں رہا تھا صرف عبادات اور باعمل ہونے پر ایک کم علم شخص کے ذہن میں مسلمان کو اور عیسائی یا یہودی میں۔ وہ لمحہ ذاتی حیثیت میں سالار کے لیے سوچنے کا تھا۔ ایبا کا اسے اچھا انسان بھی مان رہا تھا اور اچھا مسلمان بھی۔ مگر کیا واقعی وہ اس معیار پر پورا اترتا تھا کہ ایک باعمل یہودی یا عیسائی سے اپنی شناخت الگ رکھ پاتا۔

کانگو کے اس جنگل میں ایبا کا کے ساتھ بیٹھے سالار نے کبھی مذہب کو اس زاویے سے نہیں دیکھا تھا جس زاویے سے پیٹرس ایبا کا دیکھ رہا تھا۔

"یہ بدقسمتی کی بات ہے یا صرف اتفاق کہ مجھے اپنی زندگی میں کبھی اچھے مسلمان اچھے عیسائیوں یا اچھے یہودیوں سے اچھے تجربات نہیں ہوئے۔ وہ مجھے کبھی متاثر نہیں کر سکے اور جنہوں نے متاثر کیا اور جنہیں میں آج تک اچھے انسانوں کی فہرست میں رکھتا ہوں وہ کبھی مذہبی نہیں تھے۔ باعمل نہیں تھے۔

"ریونڈ جانسن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" سالار نے بے ساختہ کہا۔

"ویل!" ایبا کا کہہ کر مسکرایا تھا۔ "ان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں لیکن وہ کبھی میرے آئیڈیل نہیں بن سکے۔"

"کیوں؟" وہ سوال و جواب سالار کو عجیب لطف دے رہے تھے۔

"ان احسانوں کی ایک قیمت تھی وہ مجھے کرسچن بنانا چاہتے تھے۔ جب میں نے وہ مذہب اختیار کر لیا تو پھر انہوں نے وہ سارے احسانات ایک کرسچن بچے پر کیے۔ ایک انسان کے طور پر صرف انسان سمجھ کر تو انہوں نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ مذہب کسی کے دل اور دماغ میں زبردستی نہیں ڈالا جا سکتا۔ میں یونیورسٹی جانے تک چرچ جاتا رہا پھر نہیں گیا۔

ایبا کا مدھم آواز میں کہہ رہا تھا۔ شاید اسے ریورنڈ جانسن کو مایوس کرنے پر افسوس بھی تھا اور پچھتاوا بھی۔

"میں نے تھوڑا بہت سب مذاہب کا مطالعہ کیا ہے۔ سب اچھے ہیں۔ لیکن پتا نہیں جو انسان ان مذاہب کا پیروکار ہو جاتا ہے، وہ اپنی اچھائیاں کیوں کھو بیٹھتا ہے۔ تمہیں لگ رہا ہو گا میں فلاسفر ہوں۔"

ایبا کا کو بات کرتے کرتے احساس ہوا تھا۔ سالار بہت دیر سے خاموش تھا۔ اسے لگا، وہ شاید اس کی گفتگو میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔

"نہیں اتنا فلاسفر تو میں بھی ہوں۔ سالار نے مسکرا کر کہا۔ "تم امریکہ سے یہاں واپس کیسے آ گئے؟" سالار نے اس سے وہ سوال کیا جو اسے اکثر الجھاتا تھا۔

"ایک چیز جو میں نے ریونڈ جانسن سے سیکھی تھی۔ وہ اپنے لوگوں کے لیے ایثار تھا۔ اپنی ذات سے آگے کسی دوسرے کے لیے سوچنا۔ امریکہ بہت اچھا تھا وہاں میرے لیے مستقبل تھا۔ لیکن صرف میرا مستقبل تھا۔ میری قوم کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں کانگو کا پست قامت حقیر سیاہ فام تھا اور میں امریکہ میں بھی کانگو کا وہی رہا لیکن میں کانگو میں کچھ اور بننے کا خواب لے کر آیا ہوں۔" ایبا کا کہہ رہا تھا۔

"اور وہ کیا؟" سالار کو پھر تجسس ہوا تھا۔

"کانگو کا صدر بننے کا۔" سالار کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

"تم ہنسے نہیں؟" ایبا کا نے جواباً کہا تھا۔

"تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ میں ہنس پڑوں۔ ہارورڈ کینڈی اسکول سے پڑھنے کے بعد تمہیں اتنے ہی بڑے خواب دیکھنے چاہئیں۔" ایبا کا اس کی بات پر مسکرا دیا تھا۔

وہ مہینے سالار کے لیے بے حد پریشانی کے تھے۔ کیا کرنا چاہیے اور کیا کر سکتا تھا، کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ ایباکا کی مدد نہ بھی کرتا تب بھی۔ وہ جتنی جانفشانی سے وہ اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہا تھا۔ سالار کو یقین تھا جلد یا بدیر ورلڈ بینک کے چہرے پر کالک ملنے والا ایک بہت بڑا اسکینڈل آنے والا تھا۔ حفاظتی اقدامات کا وقت اب گزر چکا تھا۔ پیٹرس ایباکا صرف کنگالا یا سواحلی بولنے والا ایک پست قد سیاہ فام نہیں تھا جسے کانگو کے جنگلات تک محدود کیا جا سکتا۔ وہ امریکہ میں اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارنے والا شخص تھا جس کے کانٹیکٹس تھے۔ وہ رابطے وقتی طور پر اگر اس کے کام نہیں بھی آ رہے تھے تو بھی اس سے ایباکا کمزور نہیں پڑا تھا بلکہ کئی حوالوں سے وہ زیادہ طاقت ور بن کر ابھرا تھا۔ وہ صرف پگمیز کی آواز نہیں رہا تھا بلکہ بانٹو قبیلے کے بہت سے افراد کی آواز بھی بن چکا تھا جو پگمیز کی طرح جنگلات پر انحصار کرتے تھے۔

اگلا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہی ایباکا کے ساتھ اس کا میل جول ان لوگوں کی نظروں میں آ گیا تھا جن کے مفادات ورلڈ بینک کے ذریعے پورے ہو رہے تھے۔

سالار پر نظر رکھی جانے لگی تھی اور اس سے پہلے کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی ہوتی۔ انگلینڈ کے ایک اخبار نے پیٹرس ایباکا کی فراہم کی گئی معلومات کی تحقیق کرنے کے بعد کانگو کے پگمیز اور ورلڈ بینک کے کانگو کے بارانی جنگلات میں ہونے والے پراجیکٹس کے بارے میں ایک کور سٹوری کی تھی جس میں ورلڈ بینک کے کردار کے حوالے سے بہت سارے اعتراضات اٹھائے گئے تھے۔

واشنگٹن میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں جیسے ہلچل مچ گئی تھی۔ ورلڈ میڈیا میں اس معاملے کی رپورٹنگ اور کوریج کو دبانے کی کوشش کی گئی تھی مگر اس سے پہلے ہی یورپ اور ایشیا کے بہت سارے ممالک کے ممتاز اخبارات اس آرٹیکل کو ری پرنٹ کر چکے تھے اور ورلڈ بینک کے اندر مچی وہ ہلچل اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی جب سالار سکندر کی طرف سے ہیڈ آفس کو کانگو میں چلنے والے ان پروجیکٹس کے حوالے سے ایک تفصیلی ای میل کی گئی جس میں اس نے مختلف ماحولیاتی اداروں سے ملنے والا ڈیٹا بھی منسلک کیا تھا جو اس جنگلات کی اس طرح کٹائی کو ایک بڑے ماحولیاتی عدم توازن کا پیش خیمہ قرار دے چکے تھے۔ ایک انسانی المیہ کے علاوہ۔ اس کا وہ خط بینک کے اعلا عہدے داران کے لیے شدید پریشانی کا باعث بنا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب سالار سکندر کو نامعلوم ذرائع کی طرف سے دھمکیوں کا آغاز ہوا تھا۔ وہ پروجیکٹس جو انہیں چلانے والی کمپنیوں کو اربوں ڈالرز کی آمدنی دے رہے تھے بینک کے اپنے کنٹری ہیڈ کی مخالفت کا باعث بنتے تو وہ کمپنیز اور ان کے پیچھے کھڑی بین الاقوامی طاقتیں خاموش تماشائی نہیں بنی رہ سکتی تھیں۔ کوئی عام صورت حال ہوتی تو اس وقت تک سالار سکندر سے استعفیٰ لے کر اسے بڑے ہتک آمیز طریقے سے ملازمت سے فارغ کیا جا چکا ہوتا مگر اس وقت اس کا استعفیٰ انٹرنیشنل میڈیا کے تجسس کو اور ابھار دیتا۔ وہ طوفان جو ابھی چائے کے کپ میں آیا تھا وہ اس سے باہر آ جاتا۔

اس ای میل کا جواب سالار سکندر کو ایک تنبیہہ کی صورت میں دیا گیا تھا جو سادہ لفظوں میں خاموش ہو جانے کی تاکید تھی اور سالار کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔

بینک نے نہ صرف اس ای میل میں ہونے والے اس کے تجزیے کو ناپسند کیا تھا بلکہ پیٹرس ایباکا کی فراہم کی جانے والی بنیاد پر گارڈین میں شائع ہونے والی کور اسٹوری کا ملبہ بھی اس کے سر ڈالتے ہوئے اسے ایباکا اور اس کور اسٹوری میں استعمال ہونے والی معلومات کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا۔

یہ الزام سالار سکندر کے پروفیشنل کام پر ایک دھبے کے مترادف تھا۔ پیٹرس ایباکا سے ہمدردی رکھنے، متاثر ہونے اور میل جول کے باوجود سالار نے اس سے بینک کی کسی انفارمیشن یا دستاویز کی بات کبھی نہیں کی تھی۔ ایباکا نے ساری معلومات یا دستاویزات کہاں سے لی تھیں، وہ ایباکا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس تنبیہہ کے جواب میں سالار نے بینک کو اپنے استعفیٰ کی پیش کش کی تھی۔ اسے اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اسے مانیٹر کیا جاتا

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔اس کی فون کالز ٹیپ ہو رہی تھیں اور اس کی ای میلز ہیل ہو رہی تھیں۔دنوں میں اس کے آفس کا ماحول تبدیل ہو گیا تھا۔اس نے بینک کی ناراضی اور ہدایات کے باوجود ایباکا سے نہ تو اپنا میل جول ختم کیا تا نہ ہی رابطہ ختم کیا تھا۔استعفیٰ کی پیشکش کے ساتھ اس نے بینک کو جانگو میں چلنے والے جنگلات پروجیکٹ کے خلاف اپنی تفصیلی رپورٹ بھی بھیج دی تھی جو سالار سکندر کی اپنی تحقیقات اور معلومات کی بنیاد پر تھی۔اور توقع کے مطابق اسے واشنگٹن طلب کر لیا گیا تھا۔

امامہ کو اس ساری صورت حال کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔وہ امید سے تھی اور سالار اسے اس ٹینشن کا حصہ دار بنانا نہیں چاہتا تھا جس سے وہ خوف گھر رہا تھا۔وہ صرف ایباکا کے بارے میں جانتی تھی اور اس کی جدوجہد کے بارے میں۔جنگلات کے حوالے سے انٹرنیشنل الیکٹرانک میڈیا پر ہونے والی تنقید اس کی نظر میں بھی آئی تھی اور اس نے سالار سے اس کے بارے میں پوچھا بھی تھا لیکن سالار نے بڑے سرسری انداز میں اس کا ذکر کیا۔وہ اسے تفصیلات بتانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

امامہ کو صحیح معنوں میں تشویش تب ہوئی تھی۔جب اس نے اسی میڈیا میں سالار سکندر کا نام بھی نمودار ہوتے دیکھا جس کے بارے میں انٹرنیشنل میڈیا یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس پروجیکٹ کے حوالے سے ہیڈ آفس کو اختلافی رپورٹ دے چکا تھا۔اس رپورٹ کے مندرجات ابھی کسی رپورٹر تک نہیں پہنچے تھے۔

اور ان ہی حالات میں واشنگٹن سے اچانک اس کا بلاوا آیا تھا اور وہ یہ وزٹ تھا جس پر امامہ نے بالآخر اس سے پوچھا ہی لیا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہے سالار؟" وہ اس رات سالار کی پیکنگ کر رہی تھی جب پیکنگ کرتے اس نے اچانک سالار سے پوچھا تھا۔وہ اپنا بریف کیس تیار کر رہا تھا۔

"ہاں یار۔۔۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" سالار نے اس سے جواباً پوچھا۔

"تم واشنگٹن کیوں جا رہے ہو؟ وہ اپنے خدشوں کو کسی مناسب سوال کی شکل میں نہیں ڈھال سکی تھی۔

"میٹنگ ہے اور میں تو اکثر آتا جاتا رہتا ہوں کہیں نہ کہیں۔اس بار تمہیں اس طرح کے سوال کیوں پوچھنے پڑ رہے ہیں؟" اپنا بریف کیس بند کرتے ہوئے اس نے امامہ سے کہا تھا۔

"پہلے کبھی تم اتنے پریشان نہیں لگے۔" وہ اس کی بات پر چند لمحے بول نہیں سکا۔کوشش کے باوجود اس کا چہرہ اس کی ذہنی کیفیت کو امامہ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکا تھا۔

"نہیں۔۔۔ کوئی ایسی بڑی پریشانی نہیں ہے۔بس شاید یہ ہو گا کہ مجھے اپنی جاب چھوڑنی پڑے گی۔"

امامہ کے کندھے پر ہاتھ رکھے اس نے اپنے الفاظ اور لہجے کو ممکن حد تا نارمل رکھنے کی کوشش کی۔اس بار بھونچکا ہونے کی باری امامہ کی تھی۔

"جاب چھوڑنی پڑے گی؟ تم تو اپنی جاب سے بہت خوش تھے۔" وہ حیران نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔

"تھا۔۔۔ لیکن اب نہیں ہوں۔" سالار نے مختصراً کہا تھا۔"کچھ مسئلے ہیں۔تمہیں واپس آکر بتاؤں گا۔تم اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا۔کہاں ہیں وہ دونوں؟"

سالار نے بات بڑی سہولت سے بدل دی تھی۔ایک لمحہ کے لیے اس وقت اسے خیال آیا تھا کہ ان حالات میں اسے اپنے بچوں اور امامہ کو کنشاسا میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔لیکن حل کیا تھا اس کے پاس۔امامہ کی پریگنینسی کے آخری مہینے چل رہے تھے۔وہ ہوائی جہاز کا سفر نہیں کر سکتی تھی اور وہ واشنگٹن میں ہونے والی اس میٹنگ کو موخر یا کینسل کرنے کی صوابدید نہیں رکھتا تھا۔

"تم اپنا اور بچوں کا بہت خیال رکھنا۔میں صرف تین دن کے لیے جا رہا ہوں' جلدی واپس آجاؤں گا۔" وہ اب

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

بچوں کے کمرے میں بستر پر سوئے ہوئے جبریل اور عنایہ کو پیار کر رہا تھا۔ اس کی فلائٹ چند گھنٹوں بعد تھی۔
"ملازمہ کو اپنے پاس گھر پر رکھنا میری غیر موجودگی میں۔" اس نے امامہ کو ہدایت کرتے ہوئے کہا تھا۔
"تم ہماری فکر مت کرو۔ تین دن ہی کی تو بات ہے۔ تم صرف اپنی میٹنگ کو دیکھو۔ آئی ہوپ' وہ ٹھیک رہے۔" امامہ کو واقعی اس وقت تشویش اس کی میٹنگ کی ہی تھی۔
سالار اس دن آفس سے خلاف معمول جلدی آیا تھا' اور پھر وہ سارا دن گھر میں ہی رہا تھا۔ اس دن معمول کی طرح شام کے لیے بھی کوئی مصروفیات نہیں رکھی تھیں اور نہ ہی گھر آکر لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا تھا' نہ کارڈلیس فون ہاتھ میں لیے آفس کے معاملات گھر میں نپٹاتا پھرا تھا۔
وہ بس لان میں ان سب کو کھیلتے دیکھ کر خود بھی وہاں آگیا تھا۔ اس کال کو ریسیو کرنے کے بعد۔ اس نے امامہ کو بتایا تھا کہ اسے ایمرجنسی میں تقریباً" دس گھنٹے کے بعد رات کے پچھلے پہر واشنگٹن کی فلائٹ پکڑنی تھی۔ یہ بھی ایک معمول کی بات تھی۔ سالار کی مصروفیات اور سفر اسی طرح آتے تھے۔ اچانک۔ بن بتائے۔
پھر وہ بچوں کے ساتھ لان میں کھیلتا رہا تھا' امامہ کے ساتھ گپ شپ لگاتا رہا تھا۔ یہ خلاف معمول تھا۔ معمول میں ایسا صرف ویک اینڈز پر ہوتا تھا وہ بھی ہر ویک اینڈ پر نہیں۔
سالار گھڑی دیکھ کر زندگی گزارنے والا شخص تھا۔ آج اگر وہ وقت کو بھولا تھا تو کہیں کچھ تو غلط تھا۔ اس کی پریشانی کی نوعیت کیا تھی اور اس کا لیول کیا تھا۔ امامہ اس کا اندازہ تو نہیں لگا پائی تھی' لیکن اسے یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ سب کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ شادی کے چھ سال کے بعد وہ سالار کو اتنا تو پڑھ ہی سکتی تھی۔ اور اب یکدم اس کا یہ اطلاع دینا کہ مسئلہ جو بھی تھا اسے شاید اپنی جاب چھوڑنی پڑے۔ وہ پریشان ہوئی تھی تو اس لیے کیونکہ ایک جمی جمائی زندگی پھر منتشر ہو رہی تھی۔ امامہ ہاشم کی زندگی میں ہمیشہ یہی ہوتا تھا جب سب کچھ ٹھیک ہونے لگتا تو سب کچھ خراب ہو جاتا تھا۔ اسے زندگی میں بہت تبدیلیاں پسند نہیں تھیں سالار سکندر کی طرح' اور دونوں بچوں نے جیسے اس کی اس عادت کو کچھ اور پختہ کر دیا تھا۔
اسے آدھے گھنٹے میں نکلنا تھا۔ اس کا سامان پیک تھا۔ وہ دونوں چائے کا ایک آخری کپ پینے کے لیے لاؤنج میں ساتھ بیٹھے تھے اور اس وقت چائے کا پہلا گھونٹ پینے سے پہلے سالار نے اس سے کہا تھا۔
"میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میں تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔"
امامہ اپنی چائے اٹھاتے ہوئے ٹھٹکی پھر ہنسی۔ "آج بہت عرصے کے بعد تم نے کہیں جانے سے پہلے ایسی کوئی بات کہی ہے۔ خیریت ہے؟"
وہ اب اس کا ہاتھ تھپک رہی تھی۔ سالار نے مسکرا کر چائے کا کپ اٹھا لیا۔
"ہاں خیریت ہے' لیکن تمہیں اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہوں اس لیے فکر مند ہوں۔"
"اکیلی تو نہیں ہوں میں۔ جبریل اور عنایہ ہیں میرے ساتھ۔ تم پریشان مت ہو۔"
سالار چائے کے گھونٹ بھرتا رہا امامہ بھی چائے پینے لگی لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔
"تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی وہ چائے پیتے ہوئے چونکا پھر مسکرایا۔ وہ ہمیشہ اسے بوجھ لیتی تھی۔ ہمیشہ۔
"ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں لیکن ابھی نہیں کروں گا' واپس آکر کروں گا۔" اس نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔
"مجھے تمہاری یہ عادت سخت ناپسند ہے' ہر دفعہ کہیں جاتے ہوئے مجھے الجھا جاتے ہو میں سوچتی رہوں گی کہ پتا

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں کیا اعتراف کرنا ہے۔"

امامہ نے ہمیشہ کی طرح بُرا مانا تھا اور اس کا گلہ غلط نہیں تھا وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ اور جان بوجھ کر کرتا تھا۔

"اچھا دوبارہ کبھی نہیں کروں گا۔" وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ بازو پھیلائے وہ ہمیشہ کی طرح جانے سے پہلے امامہ سے آخری بار مل رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ایک ایک گرم جوش معانقہ۔

"آئی ول مس یو جلدی آنا۔" وہ ہمیشہ کی طرح جذباتی ہوئی تھی اور وہی کلمات دہرائے تھے جو وہ ہمیشہ دہراتی تھی۔

پورچ میں کھڑے ایک آخری بار اس کو خدا حافظ کہنے کے لیے اس نے الوداعیہ انداز میں سالار کی گاڑی کے چلتے ہی ہاتھ ہلایا تھا۔ گاڑی تیز رفتاری سے طویل پورچ کو عبور کرتے ہوئے کھلے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئی تھی۔

امامہ کو لگا تھا زندگی اور وقت دونوں تھم گئے تھے۔ وہ جب کہیں چلا جاتا' وہ اسی کیفیت سے دوچار ہوتی تھی' آج بھی ہو رہی تھی گارڈ نے اب گیٹ بند کر دیا تھا۔

شادی کے چھ سال کے بعد بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ زندگی جیسے ایک پٹڑی پر چلنے لگتی ہے۔ روزمرہ کے معمول کی پٹڑی پر۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انسان دائروں میں سفر کرنے لگتا ہے۔

دو بچوں کی آمد سالار اور امامہ کی زندگی کو بھی بڑی حد تک ایک دائرے کے اندر لے آئی تھی۔ جہاں اپنی ذات پیچھے چلی جاتی ہے۔ سینٹر اسٹیج بچوں کے پاس چلا جاتا ہے۔ وہ خدشات' توقعات اور غلط فہمیوں کا وہ جال جس میں ایک نیا شادی شدہ جوڑا شادی کے شروع کے کچھ عرصہ میں جکڑا رہتا ہے۔ وہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ اعتماد لمحہ بھر میں بداعتمادی میں نہیں بدلتا۔ بے اعتباری پل بھر میں غائب ہونا سیکھ جاتی ہے۔ گلہ گونگا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بندھن عادت میں بدلنے لگتا ہے اور زندگی معمول بنتے ہوئے یوں گزرنے لگتی ہے کہ انسان دنوں' ہفتوں مہینوں کی نہیں سالوں کی گنتی بھول جاتا ہے۔

امامہ بھی بھول گئی تھی۔ پیچھے پلٹ کر وہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ پیچھے یادیں تھیں اور یادیں آکٹوپس بن کر لپٹ جانے کی خاصیت رکھتی تھیں۔ پیچھے اب کچھ رہا بھی نہیں تھا' اور جو رہ گئے تھے ان کے لیے وہ کب کی مر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

کسی اپنے کی موت انسان کو پل بھر میں کس طرح خاک کر دیتی ہے یہ کوئی امامہ سے پوچھتا۔

بیس سال کی عمر میں گھر سے نکلتے ہوئے اس کو یہی لگا تھا' وہ تو مر ہی گئی تھی۔ جیتے جی۔ کسی کا کوئی تعلق ایک رشتہ ختم ہوتا ہے اس کے تو سارے ہی تعلقات ایک ہی وقت میں ختم ہوئے تھے۔ اسے لگا تھا ایسا صدمہ ایسی تکلیف تو کوئی اور شے اسے پہنچا ہی نہیں سکتی تھی۔

جلال انصر کو کھو دینا اس کی زندگی کا دوسرا سب سے بڑا صدمہ تھا۔ وہ نوعمری کی محبت تھی۔ محبت نہیں پاگل پن تھا جس میں وہ مبتلا ہوئی تھی۔ عشق نہیں تھا' عقیدت تھی' جو وہ اس شخص کے لیے پال بیٹھی تھی۔ ساری زندگی اس کے ساتھ گزارنے کے خواب' خواہش اور امید ایک ہی وقت چکنا چور ہوئے تھے اور ایسے چکنا چور ہوئے تھے کہ اس کا پورا وجود کئی سال انہیں کرچیوں سے اٹھا رہا تھا۔ تب اسے لگا تھا یہ تکلیف موت جیسی تھی' ایسی بے بسی اور بے توقیری زندگی میں بس ایک ہی بار محسوس کرتا ہے انسان' اور صرف محبت کے کھو دینے پر ہی کرتا ہے۔

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوئی اور چیز کہاں ایسے مارتی ہے انسان کو۔

وسیم اور سعد کی موت نے اسے بتایا تھا کہ مارتی تو موت ہی ہے اور جیسی مار وہ انسان کو دیتی ہے کوئی اور تکلیف نہیں دیتی۔ آب حیات پی کر بھی انسان اپنی موت ہی روک سکتا ہے پر ان کو جانے سے کیسے روک سکتا ہے جو جان سے بھی پیارے ہوتے ہیں۔

وہ اس وقت نیویارک میں تھی۔ اس کے ہاں پہلا بچہ ہونے والا تھا۔ وہ ساتویں آسمان پر تھی کیونکہ جنت پاؤں کے نیچے آنے والی تھی۔ نعمتیں تھیں کہ گنی ہی نہیں جا رہی تھیں۔ تیسرا مہینہ تھا اس کی پریگننسی کا۔ جب ایک رات سالار نے اسے نیند سے جگایا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ اسے نیند سے جگا کر کیا بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور شاید ایسی ہی کیفیت سالار کی تھی کیونکہ اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کن الفاظ میں اتنے بڑے نقصان کی اطلاع دے۔ اس سے پہلے سکندر عثمان اور وہ یہی ڈسکس کرتے رہے تھے کہ امامہ کو اطلاع دینی چاہیے یا اس حالت میں اس سے یہ خبر چھپا لینی چاہیے۔

سکندر عثمان کا خیال تھا امامہ کو یہ خبر ابھی نہیں پہنچانی چاہیے، لیکن سالار کا فیصلہ تھا کہ وہ اس سے اتنی بڑی خبر چھپا کر ساری عمر کے لیے اسے کسی رنج میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ وہ وسیم سے فون اور میسج کے ذریعے ویسے بھی رابطے میں تھی، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اسے ایک آدھ دن میں اس کے بارے میں اطلاع نہ مل جاتی۔

وہ دونوں قادیانیوں کی ایک عبادت گاہ پر ہونے والی فائرنگ میں درجنوں دوسرے لوگوں کی طرح مارے گئے تھے اور امامہ چند گھنٹے پہلے ایک پاکستانی چینل پر یہ نیوز دیکھ چکی تھی، وہ اس جانی نقصان پر رنجیدہ بھی ہوئی تھی ایک انسان کے طور پر۔ مگر اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان لوگوں میں اس کے دو اتنے قریبی لوگ بھی شامل تھے۔ اسے شبہ ہوتا بھی کیسے۔ وہ اسلام آباد کی عبادت گاہ نہیں تھی ایک دوسرے شہر کی تھی۔ سعد اور وسیم وہاں کیسے پہنچ سکتے تھے اور وسیم تو بہت کم اپنی عبادت گاہ میں جاتا تھا۔

بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ ایک ہفتے کے بعد وہ اور سعد نیویارک آنے والے تھے اس کے پاس، تقریباً" دس سالوں کے بعد وہ سعد سے ملنے والی تھی۔ بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ وسیم نے اس سے وعدہ کیا تھا، وہ اپنے عقائد سے تائب ہو جائے گا۔ اور وہ سعد کو بھی سمجھائے گا جو اس سے زیادہ کٹر تھا اپنے مذہبی عقائد میں، اور بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ ایک دن پہلے تو اس نے وسیم سے بات کی تھی، اسے ان کچھ چیزوں کی فہرست ای میل کی تھی جو اسے پاکستان سے چاہیے تھیں۔

اور سالار..... وہ کیا کہہ رہا تھا۔ کیا وہ پاگل ہو گیا تھا۔ یا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔ ایک بار پھر سے۔ جیسے وہ نو سال ڈاکٹر سبط علی کے گھر دیکھتی رہی تھی۔

وہ صبر نہیں تھا وہ شاک بھی نہیں تھا۔ وہ بے یقینی تھی۔ سالار کو اندازہ تھا مگر وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ اب اس انکشاف کے بعد اس سے کیسے نکالے۔

وہ اگلے کئی گھنٹے گم صم آنسو بہائے بغیر سالار کے کسی سوال اور بات کا جواب دیے بغیر ایک بت کی طرح وہیں بستر پر بیٹھی رہی تھی۔ یوں جیسے انسان نہیں برف کی سل بن گئی تھی۔ اور برف کی سل نہیں جیسے ریت کی دیوار تھی جو ڈھے گئی تھی۔ اسے لگا تھا وہ اب کبھی زندگی میں اپنی انگلی تک نہیں ہلا سکے گی۔ پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکے گی۔ سانس نہیں لے سکے گی۔ جی نہیں سکے گی۔ کوئی ایسے تو نہیں جاتا..... ایسے..... اس کی حالت دیکھ کر سالار کو شدید پچھتاوا ہوا تھا اس نے سکندر عثمان کی بات نہ مان کر کتنی بڑی غلطی کی تھی اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔ سالار نے اپنے ایک ڈاکٹر کزن کو بلایا تھا گھر پر ہی اسے دیکھنے کے لیے۔

اس کے بعد کیا ہوا تھا امامہ کو ٹھیک سے یاد نہیں تھا۔ سالار کو لمحہ لمحہ یاد تھا۔ وہ کئی ہفتے اس نے اسے پاگل پن

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی سرحد پر جاتے اور وہاں سے پلٹتے دیکھا تھا۔ وہ چپ ہوتی تو کئی کئی دن چپ ہی رہتی یوں جیسے اس گھر میں موجود ہی نہیں تھی۔ روتی تو گھنٹوں روتی۔ سوتی تو پورا دن اور رات آنکھیں نہیں کھولتی اور جاگتی تو دو دو دن بستر پر چند لمحوں کے لیے بھی لیٹے بغیر لاؤنج سے بیڈ روم اور بیڈ روم سے لاؤنج کے چکر کاٹتے کاٹتے اپنے پاؤں سجا لیتی۔ یہ صرف ایک معجزہ تھا کہ اس ذہنی حالت اور کیفیت میں بھی جبریل کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ جیسے یہ فراموش ہی کر بیٹھی تھی کہ اس کے اندر ایک اور زندگی پرورش پا رہی تھی۔ ذہن یادوں سے نکل پاتا تو جسم کو محسوس کرتا۔

اور وحشت جب کچھ کم ہوئی تھی تو اس نے سالار سے پاکستان جانے کا کہا تھا۔ اسے اپنے گھر جانا تھا۔ سالار نے اس سے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ وہ کس گھر کو اپنا گھر کہہ رہی تھی۔ اس نے خاموشی سے دو سیٹیں بک کروالی تھیں۔

"مجھے اسلام آباد جانا ہے۔" اس نے سالار کے پوچھنے پر کہا تو۔ سالار نے بحث نہیں کی تھی اگر اس کے گھر والوں سے ملاقات اس کو نارمل کر دیتی تو وہ اس ملاقات کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔

ہاشم مبین ان کے ہمسائے تھے۔ ان کے گھر میں آنے والی قیامت سے سالار سکندر کا خاندان بے خبر نہیں تھا۔ مذہب کا فرق تھا۔ خاندانی اختلافات تھے، دشمنی تھی۔ اور نفرت بھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی یہ خواہش کبھی نہیں تھی کہ ہاشم مبین کے ساتھ وہ ہوتا جو ہوا تھا۔ بڑھاپے میں جوان اولاد اور وہ بھی دو بیٹوں کو گنوانا کیسا صدمہ تھا سکندر عثمان اندازہ کر سکتے تھے۔ وہ خود باپ تھے۔ انہوں نے ہاشم مبین کے گھر جا کر ان سے دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ تعزیت کی تھی۔ اس صدمے میں بھی ہاشم مبین نے بے حد سرد مہری کے ساتھ ان کی تعزیت قبول کی تھی۔

سکندر عثمان کو امید نہیں تھی کہ وہ امامہ سے ملیں گے۔ انہوں نے سالار سے اپنے خدشات کا ذکر ضرور کیا تھا، لیکن امامہ کو جس حالت میں انہوں نے دیکھا تھا، وہ سالار کو ایک کوشش کر لینے سے روک نہیں سکے تھے۔ انہیں امامہ کو دیکھ کر دلی رنج ہوا تھا۔

ہاشم مبین نے نہ صرف فون پر سکندر عثمان سے بات کرنے سے انکار کیا تھا، بلکہ سالار کو ان کے گھر پر گیٹ سے اندر جانے نہیں دیا گیا۔ سکندر عثمان اور وہ دونوں مایوسی کے عالم میں واپس آ گئے تھے۔ امامہ کی سمجھ میں ان کی مایوسی اور بے بسی نہیں آئی تھی وہ یہاں باپ کے گھر کے برابر والے گھر میں بیٹھ کر سب حالات سے واقف ہونے کے باوجود یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اگر وہ اس کے گھر جا سکتے تھے تو وہ کیوں نہیں جا سکتی تھی۔ گیٹ کے اندر نہ جا سکتی گیٹ تک تو چلی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا تھا۔ وہ اس کی جان لے لیتے۔ بس جان ہی تو جاتی نا۔ وہ تکلیف اور اذیت تو ختم ہو جاتی جس میں وہ تھی۔

سالار اس کے سامنے بے بس تھا، لیکن وہ پہلا موقع تھا جب اس نے امامہ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اس نے امامہ کو اس کے گھر جانے کی کوشش بھی نہیں کرنے دی تھی۔

"تمہیں اگر گھر جانا ہے تو پہلے اپنے باپ سے بات کرو۔ وہ اجازت دیں تو پھر میں تمہارے ساتھ چلوں گا، لیکن میں تمہیں بغیر اجازت کے وہاں گیٹ پر گارڈز کے ہاتھوں ذلیل ہونے کے لیے نہیں بھیج سکتا۔"

اس کے رونے اور گڑگڑانے کے باوجود سالار نہیں پگھلا تھا۔ امامہ نے اپنے باپ سے فون پر بات کر کے اجازت لینے کی ہامی بھر لی تھی۔ مگر اس فون کال نے سب کچھ بدل دیا تھا۔ جو چیز سالار اسے نہیں سمجھا سکا تھا وہ اس فون کال میں ہاشم مبین نے سمجھا دی تھی۔

"یہ جو کچھ ہوا ہے تمہاری وجہ سے ہوا۔ تم جن لوگوں کے ساتھ جا بیٹھی ہو ان ہی لوگوں نے جان لی ہے میرے دونوں بیٹوں کی۔ اور تم اب میرے گھر آنا چاہتی ہو۔ قاتلوں کے ساتھ میرے گھر آنا چاہتی ہو۔" وہ ہذیانی انداز میں

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

چلاتے اور اسے گالیاں دیتے رہے تھے۔

"تم لوگ۔" اور "ہم لوگ" فرق کتنا بڑا تھا امامہ کو یاد آگیا تھا۔ آج بھی۔ اس سب کے بعد بھی اس غم کے ساتھ بھی اسے پچھتاوا نہیں تھا کہ اس نے وہ مذہب چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد آیا تھا ایک بار اس کے باپ نے کہا تھا وہ ایک دن گڑگڑاتے ہوئے اس کے پاس آکر معافی مانگے گی۔ اور وہ آج یہی کرنے جا رہی تھی۔ پر کیوں کرنے جا رہی تھی؟۔

خون کا رشتہ تھا۔ تڑپ تھی۔ وہ کھنچی تھی ان کی طرف۔ اب جب اسے ان سے پہلے کی طرح جان کا خوف نہیں رہا تھا۔ پر خون کا رشتہ صرف اسی کے لیے کیوں تھا۔ تڑپ تھی تو صرف اس کو کیوں تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کے پاس ان لوگوں کے سوا اور کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ وہ اپنے لوگوں کے پاس تھے۔ اس کے پاس سالار تھا۔ لیکن وہ خونی رشتہ نہیں تھا محبت کا رشتہ تھا۔ خون جیسی تڑپ پیدا ہونے کے لیے ابھی اس کو کئی سال چاہیے تھے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ماؤف ہونے کے باوجود اسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ جو غم اسے وہاں کھینچ کر لایا تھا۔ وہ غم اس گھر میں جا کر پچھتاوے میں بدل جاتا۔

ہاشم مبین کی مزید کوئی بات سننے کے بجائے اس نے فون رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ بلک بلک کر روئی تھی۔ اس گھر میں اور اس دنیا میں اب اس کا خونی رشتہ کوئی نہیں رہا تھا۔ اس گھر میں صرف وسیم اس کا تھا۔ اور وسیم جا چکا تھا۔ وہ ایک کھڑکی جو پچھواڑے میں کھلی تھی ٹھنڈی ہوا کے لیے۔ وہ آندھی کے زور سے بند ہو گئی تھی۔ اب اس کھڑکی کو دوبارہ کبھی نہیں کھلنا تھا۔

وہ سالار سکندر کے ساتھ واپس نیویارک لوٹ آئی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا وہ نارمل ہو رہی تھی' آہستہ آہستہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ کچھ وقت لگنا تھا۔ امامہ بھی ایسا ہی سمجھتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا وہاں موجود تنہائی نے امامہ کے اعصاب کو ایک بار پھر مفلوج کرنا شروع کر دیا تھا۔ سالار پی ایچ ڈی کر رہا تھا اور ساتھ ایک آرگنائزیشن میں ہفتے میں تین دن کے لیے پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔ وہ صبح پانچ بجے گھر سے نکلتا تھا۔ اور رات کو کہیں آٹھ نو بجے اس کی واپسی ہوتی تھی اور واپسی پر وہ اتنا تھکا ہوا ہوتا تھا کہ ایک دو گھنٹے ٹی وی دیکھ کر کھانا کھا کر وہ دوبارہ سو جاتا تھا۔

امامہ بارہ چودہ گھنٹے ایک بیڈ روم کے آٹھویں منزل کے اس اپارٹمنٹ میں بالکل تنہا ہوتی تھی اور تنہائی کا یہ دورانیہ سالار کے گھر آجانے کے بعد اس کے سو جانے پر اور بڑھ جاتا تھا۔ ایک بیڈ روم ایک لاؤنج اور کچن ایریا کے علاوہ جہاں کچھ بھی نہیں تھا جہاں وہ جا کر کچھ وقت گزار سکتی۔ گھر کا کام بھی بہت مختصر تھا کیونکہ گھر چھوٹا تھا۔ نیند اسے آتی نہیں تھی۔ اور گھر میں کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ صرف سوچنے کے علاوہ۔ کوئی ٹی وی کہاں تک دیکھ سکتا تھا۔ کتابیں کتنی پڑھ سکتا تھا۔ جب ذہن صرف اپنی زندگی کے سارے بُرے دنوں کو سوچتے ہوئے وہیں اٹکا رہتا تھا۔ کیا ہو سکتا تھا؟۔ کیا کرنا چاہیے تھا؟۔ کیا کر لیتی تو کس چیز سے بچ جاتی۔ کس چیز سے بچ جاتی تو کون سا صدمہ اسے نہ ہوتا۔ زندگی میں کون کون سی غلطیاں ہوئی تھیں اس سے۔؟ کون سے غلطی زیادہ بڑی تھی۔ کون سی چھوٹی؟۔ کس کو نہ کرنے سے کس سے بچ سکتی تھی وہ۔

وہ سارا دن اسی حساب کتاب میں لگی رہتی تھی۔ وسیم اس کے ذہن سے نہیں نکلتا تھا وہ روز اپنے فون میں موجود اس کے اور اپنے میسجز کو جو سینکڑوں کی تعداد میں ہوتے بیٹھ کر پڑھنا شروع کرتی اور پھر گھنٹوں اسی میں گزار دیتی اسے وہ سینکڑوں میسجز اب جیسے زبانی حفظ ہو چکے تھے' لیکن پتا نہیں خود اذیتی کی وہ کون سی سیڑھی تھی جس پر بیٹھی وہ ہر روز ایک ہی کام بھیگی آنکھوں کے ساتھ کرتی رہتی تھی۔ اسے دن میں کب کیا کھانا تھا اسے یاد نہیں رہتا تھا۔ کب کپڑے بدلے تھے اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ اس کا ذہن جیسے کسی نے قید کر دیا تھا۔ لاکھ کوشش پر بھی وہ اس پنجرے سے آزاد نہیں ہوتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ کوشش نہیں کرتی تھی۔

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ بے پناہ کوشش کرتی تھی اپنے ذہن کو ان سب چیزوں اور یادوں سے ہٹانے کی۔ وہ قرآن پڑھتی تھی نماز پڑھتی تھی۔ مگر اس کے بعد وہ وحشت کے اسی جنگل میں ایک بار پھر پہنچ جاتی تھی۔ بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ وہاں اس سے کوئی بات کرنے والا نہیں تھا۔ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے وہ گونگوں کی طرح چلتی پھرتی اپنے کام میکانیکی انداز میں کرتی تھی۔ سالار کہتا تھا وہ پاکستان فون کرلے۔ وہ پاکستان کس کو فون کرتی وہ یہ نہیں بتاتا تھا وہاں کون تھا ایسا جو اپنے کام چھوڑ کر گھنٹوں فون پر بات کرتا۔ وسیم کے علاوہ۔ بات جہاں سے شروع ہوتی تھی پھر وہیں آکر رک جاتی تھی۔ اپنے وجود کے ناکارہ پن اور زندگی کی بے معنویت امامہ ہاشم نے جیسے اس دور میں محسوس کی تھی اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ اس کا اپنا وجود اس کے لیے سب سے بڑا بوجھ بن گیا تھا۔ اسے وہ کہاں پھینک آتی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بستر پر صبح نیند سے آنکھ کھلتے ہی اسے یہ خیال آتا تھا۔ ایک اور دن۔ پھر وہی روٹین۔ پھر وہی تنہائی۔ وہی ڈپریشن۔ وہ آہستہ آہستہ ڈپریشن کی طرف جانا شروع ہوگئی تھی اور سالار ایک بار پھر اپنے آپ کو بے حد بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے لیے کیا کرتا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جس سے وہ پھر پہلے جیسی ہوجاتی۔ وہ اپنی ورک روٹین نہیں بدل سکتا تھا۔ وہ نیویارک میں رہ رہے تھے اور ان کے جو اخراجات تھے انہیں پورا کرنے کے لیے اسے کام کرنا ہی تھا۔ وہ پی ایچ ڈی کررہا تھا۔ اسے گھنٹوں لائبریری میں بیٹھنا پڑتا تھا اپنی ریسرچ کے لیے۔ اور وہ یہ کام بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

چودہ گھنٹے تک اپنے کاموں اور سفر سے خوار ہونے کے بعد وہ تھکا ہارا گھر آنے پر بھی امامہ کے کہنے پر کہیں بھی چلنے کے لیے تیار رہتا تھا اور کہیں نہیں تو اپارٹمنٹ کے باہر پارک تک۔۔۔ لیکن وہ اس سے کہیں جانے کا کہتی ہی نہیں تھی وہ اس سے معمول کی گپ شپ کرنے کی بھی کوشش کرتا تھا۔ مگر وہ چند جملے بول کر چپ ہوجاتی تھی یوں جیسے اب وہ سالار سے مزید کیا بات کرے اسے یہی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ہونے والی اولاد جوان کی زندگی کا شادی کے بعد سب سے بڑا واقعہ تھا۔ دونوں ہی کے لیے جیسے غیر اہم ہوگیا تھا۔ دونوں کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ وہ بچے کے بارے میں بھی بات کریں تو کیا بات کریں۔ چند جملوں کے بعد ان کے پاس اس کے بارے میں بھی بات کرنے کو لفظ نہیں رہتے تھے۔

تسلی، دلاسا اور دل جوئی کے لیے سالار جو کرسکتا تھا کرچکا تھا۔ وہ اب وسیم کے بارے میں کسی سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ صبح سویرے گھر سے اس کے بارے میں سوچتے ہوئے نکلتا اور رات کو جب گھر واپس آنے کے لیے ٹرین میں بیٹھتا تو بھی اس کے بارے میں سوچ رہا ہوتا تھا۔ امامہ کی ذہنی کیفیت نے جیسے اس کے اعصاب شل کرنے شروع کردیے تھے۔ جبریل کی پیدائش میں ابھی بہت وقت تھا اور وہ اسے اس جہنم سے نکالنا چاہتا تھا جس میں وہ ہر وقت نظر آتی تھی۔

سائیکاٹرسٹ اس کی پریگنینسی کی وجہ سے اسے تیز دوائیں نہیں دے رہے تھے مگر اس کا خیال تھا باقاعدہ علاج کے بغیر وہ بہت جلد نارمل نہیں ہوسکتی تھی۔ فیملی کا خیال تھا وہ اگر اسے ساتھ لے جانے کے بجائے کچھ دیر پاکستان میں ان کے پاس رہنے دیتا تو وہ اب تک نارمل ہوچکی ہوتی۔۔۔ وہاں فیملی سپورٹ ہوتی ذہن اور دل کو بہلانے کے لیے وہ اس کے لیے بہت کچھ کرسکتے تھے۔ سات سمندر پار بیٹھے وہ اس کے لیے کیا کرتے۔ سالار کو ان کی بات بھی ٹھیک لگتی تھی لیکن وہ امامہ کے بارے میں خائف تھا کہ اسے اکیلا پاکستان چھوڑ جانے پر وہ کسی نقصان کا شکار نہ ہوجائے۔ لیکن جو کچھ اب ہو رہا تھا وہ بھی اس سے برداشت نہیں ہوپا رہا تھا۔

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے سے پہلے ہی ایک رات امامہ نے۔۔۔ کہا تھا۔

"مجھے پاکستان جانا ہے۔"

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کیوں؟" سالار کو اپنا سوال خود بے تکا لگا۔

وہ بہت دیر چپ رہی کیوں جیسے اپنے الفاظ جمع کر رہی ہو پھر اس نے جو کہا تھا اس نے سالار کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔

"کل میں نے وسیم کو دیکھا۔۔۔ وہاں کچن کاؤنٹر کے پاس وہ پانی پی رہا تھا۔۔۔ دو دن پہلے بھی میں نے اسے دیکھا تھا' وہ اس کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔۔۔" بات کرتے ہوئے اس کی آواز بھرائی اور وہ شاید اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کے لیے رکی تھی۔

"مجھے لگتا ہے میں کچھ عرصہ اور یہاں رہی تو پاگل ہو جاؤں گی۔ یا شاید ہونا شروع ہو چکی ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتی۔"

اس نے چند لمحوں کے بعد دوبارہ بات کرنی شروع کی تھی۔ وہ اگر واہموں کا شکار ہو رہی تھی تو وہ اس بات سے واقف بھی تھی اور اس سے فرار چاہتی تھی تو یہ جیسے ایک مثبت علامت تھی۔

"ٹھیک ہے' ہم واپس چلے جاتے ہیں مجھے صرف چند ہفتے دے دو سب کچھ وائنڈ اپ کرنے کے لیے۔"

سالار نے جیسے لمحوں میں فیصلہ کیا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے امامہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم پی ایچ ڈی کر رہے ہو' تم کیسے میرے ساتھ جا سکتے ہو؟"

"میں پی ایچ ڈی چھوڑ دوں گا۔۔۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری ضروری نہیں ہے۔۔۔ تم اور تمہاری زندگی ضروری ہے۔"

سالار نے جواباً اس سے کہا' کچھ کہنے کی کوشش میں امامہ کی آواز بھرائی وہ کہہ نہیں پائی۔ اس نے دوبارہ بولنے کی کوشش کی اور اس بار وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

"نہیں تم ساتھ نہیں آؤ گے۔۔۔ یہ کیوں ضروری ہے کہ ساری زندگی تم قربانیاں ہی دیتے رہو میرے لیے۔۔۔ اب پی ایچ ڈی چھوڑو۔۔۔ اپنا کیریئر چھوڑو۔۔۔ تمہاری زندگی ہے۔ قیمتی ہے تمہارا وقت' تم کیوں اپنی زندگی کے اتنے قیمتی سال میرے لیے ضائع کرو۔"

سالار نے کچھ کہنے کی کوشش کی' کوئی اور موقع ہوتا تو اس کا یہ اعتراف اس کو خوشی دیتا' لیکن اب اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے اسی طرح کہہ رہی تھی۔

"I am not suitable for you میں جتنا سوچتی ہوں مجھے یہی احساس ہوتا ہے تمہارا ایک برائٹ فیوچر ہے' تم زندگی میں بہت کچھ حاصل کر سکتے ہو لیکن میرا وجود تمہاری ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ مجھے احساس جرم ہوتا ہے کہ بار بار میری وجہ سے تمہیں پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔"

وہ چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔۔۔ وہ رو رہی تھی اور بول رہی تھی۔ اور وہ چاہتا تھا وہ اور روئے اور بولے۔۔۔ وہ غبار جو اس کے اندر سے چھٹتا ہی نہیں تھا وہ کسی طرح تو چھٹے۔

"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں' لیکن میں بے بس ہوں میں کوشش کے باوجود بھی اپنے آپ کو نارمل نہیں کر پا رہی۔۔۔ اور اب۔۔۔ اب وسیم کو دیکھنے کے بعد تو میں اور بھی۔۔۔ اور بھی۔" وہ بولتے بولتے رک گئی صرف اس کے آنسو اور ہچکیاں تھیں جو نہیں تھمی تھیں۔

"سالار' تم بہت اچھے انسان ہو۔۔۔ بہت اچھے ہو تم بہت قابل ہو۔۔۔ تم مجھ سے بہتر عورت ڈیزرو کرتے ہو۔۔۔ میں نہیں۔

Im a worthless woman

I m a nobody

تمہیں ایسی عورت ملنی چاہیے جو تمہارے جیسی ہو۔۔۔ تمہیں زندگی میں آگے بڑھنے میں سپورٹ کرے۔۔۔

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

میری طرح تمہارے پاؤں کی بیڑی نہ بن جائے۔"

"اور یہ سب کچھ تم آج کہہ رہی ہو جب ہم اپنا پہلا بچہ expect کر رہے ہیں....؟"

"مجھے لگتا ہے یہ بچہ بھی مر جائے گا۔" اس نے عجیب بات کہی تھی.... سالار نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"تم کیوں اس طرح سوچ رہی ہو.... اسے کچھ نہیں ہو گا۔" سالار پتا نہیں کس کو تسلی دینا چاہتا تھا لیکن اس وقت امامہ سے زیادہ اس کی اپنی حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔

"تم بس مجھے پاکستان بھیج دو۔" امامہ نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر وہی مطالبہ دہرایا تھا۔

"میں تمہیں اسلام آباد نہیں بھیجوں گا۔" سالار نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"میں وہاں جانا بھی نہیں چاہتی مجھے سعیدہ اماں کے پاس جانا ہے میں وہاں رہ لوں گی۔" وہ اس کی بات پر حیران ہوا تھا۔ "سعیدہ اماں نہیں تم ڈاکٹر صاحب کے پاس چلی جاؤ۔ اگر وہاں رہنے پر تیار ہو تو میں تمہیں بھیج دیتا ہوں۔" سالار نے یک دم کچھ سوچ کر کہا تھا۔

"ٹھیک ہے مجھے انہیں کے پاس بھیج دو۔" وہ ایک لمحہ کے بھی تامل کے بغیر تیار ہو گئی تھی۔ "اگر تم وہاں جا کر خوش رہ سکتی ہو تو ٹھیک ہے میں تمہیں بھیج دیتا ہوں واپس کب آؤ گی؟"

وہ پہلا موقع تھا ساری گفتگو میں جب امامہ نے اس سے نظر ملائی تھی.... یہ دل بس خواری کا نام ہے عزت یوں اتار کر رکھتا ہے جیسے عزت کوئی شے ہی نہیں.... بے عزتی کو اتنا معمولی کر دیتا ہے کہ انسان آنکھ میں پانی بنا کر رکھنے لگتا ہے.... پی جانے لگتا ہے۔ وہ ساری دنیا کو اپنی ٹھوکر پر رکھنے والا مرد تھا اور رسی ڈالی تھی تو اللہ نے اس کے گلے میں محبت کی رسی ڈالی تھی.... رسی تھی زنجیر نہیں تھی لیکن بیڑی سے زیادہ بڑی اور کڑی تھی۔

امامہ کو لگا تھا وہ اس سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں رہی تھی اور نظریں ملا کے کرنا ہی کیا تھا.... کچھ کہنے کے لیے لفظ ہی نہیں تھے.... جو بھی گلے تھے اسے اپنی ذات سے تھے.... ساری خامیاں اپنے اندر تھیں.... سالار کو وہ جیسے بدقسمتی کے اس جنگل سے آزاد کر دینا چاہتی تھی جس میں وہ خود سالوں سے پھنسی ہوئی تھی اور شاید پھنسا ہی رہنا تھا اسے.... اس کی بے لوث.... بے مول محبت کا وہ اتنا صلہ تو دیتی اسے.... کہ اس بدقسمتی میں اسے نہ گھسیٹتی اسے آگے بڑھ جانے دیتی۔

"واپس آجانا۔" اس کی لمبی خاموشی کو سالار نے مختصر زبان دی تھی.... مشورہ نہیں تھا منت تھی.... خواہش نہیں تھی بے بسی تھی.... جو ختم ہی نہیں ہو رہی تھی.... امامہ نے اس کی بات خاموشی سے سن کر خاموشی سے ہی جواب دیا تھا۔

وہ ایک ہفتے کے بعد پاکستان واپس چلی آئی تھی اور جیسے کسی قید سے چھوٹ آئی تھی۔ امریکہ سے واپس آنے سے پہلے وہ گھر میں پڑی ہوئی اپنی ایک ایک چیز وہاں سے ہٹا آئی تھی یوں جیسے رگڑ رگڑ کر سالار کے گھر اور زندگی سے اپنے وجود اور یادوں کے سارے نقوش کو مٹا دینا چاہتی ہو.... جیسے سالار کی زندگی کو ہر اس نحوست سے پاک صاف کر دینا چاہتی ہو جو اس کے ساتھ اس کے گھر اور زندگی میں داخل ہوئی تھی۔

وہ واپس نہ آنے کے لیے جا رہی تھی سالار کو اس کا احساس اس کی ایک ایک حرکت سے ہو رہا تھا لیکن وہ پھر بھی اسے جانے دینا چاہتا تھا۔ اگر فاصلہ اور اس سے دوری اسے صحت یاب کر سکتی تھی تو وہ چاہتا تھا وہ دور ہو جائے لیکن ٹھیک ہو جائے۔ چار مہینے اور گزرتے تو ان کی اولاد اس دنیا میں آجاتی اور وہ اس کی بقا بھی چاہتا تھا اور وہ اپنی ہمت بھی جانتا تھا جواب آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی تھی۔ وہ ڈپریشن امامہ کے وجود سے جیسے اس کے وجود میں

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

ٹرانسفر ہونے لگا تھا۔

جس شام اس کی فلائٹ تھی وہ ایک بار پھر دل گرفتہ ہو رہا تھا۔۔۔ اسے لگا تھا اب وہ گھر ٹوٹنے والا تھا جو اس نے بڑی مشکل سے بنایا تھا۔۔۔ امامہ بھی خاموش تھی مگر پتا نہیں سالار کو کیوں وہ پر سکون لگی تھی۔۔۔ پر سکون۔۔۔ مطمئن خوش وہ اس کے چہرے کی کتاب پر اس دن یہ نہیں پڑھنا چاہتا تھا۔

"مت جاؤ۔" وہ ٹیکسی کے آنے پر اس کا بیگ اٹھا کر بیڈ روم سے لاؤنج میں لایا تھا۔ وہ اپنا ہینڈ کیری کھینچتے ہوئے اس کے پیچھے آئی تھی اور اس نے ہینڈ کیری بھی دوسرے سامان کے ساتھ سالار کو تھمانے کی کوشش کی تھی' جب سالار نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس نے خلاف توقع ہاتھ نہیں کھینچا تھا' بس ہاتھ اس کے ہاتھوں میں رہنے دیا تھا۔ بہت دیر سالار اس کا ہاتھ یونہی پکڑے رہا تھا پھر اس نے بہت دل گرفتی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

وہ لمس امامہ کے ساتھ آیا تھا۔ اس قید سے آزاد ہونے کے بعد بھی اسے بے قرار کرتا رہا تھا۔ کئی سال بعد وہ ایک بار پھر ڈاکٹر سبط علی کے گھر پناہ کے لیے آئی تھی۔ اور اسے اس بار بھی پناہ مل گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور اس کی بیوی اس کی ذہنی حالت سے واقف تھے اور وہاں ان کے پاس آکر کم از کم کچھ دنوں کے لیے امامہ نے یونہی محسوس کیا تھا جیسے وہ کسی قید تنہائی سے نکل آئی تھی۔۔۔ مگر یہ کیفیت بھی وقتی تھی۔ وہ جس سکون کی تلاش میں تھی وہ یہاں بھی نہیں تھا۔۔۔ بے چینی اور بے قراری یہاں بھی ویسی ہی تھی اور ڈاکٹر سبط علی ان بیوی اور سعیدہ اماں کی محبت بھی اس کے لیے مرہم ثابت نہیں ہو پا رہی تھی۔ سالار اسے روز فون کرتا تھا کبھی وہ کال ریسیو کر لیتی کبھی نہیں۔۔۔ کبھی وہ اس سے لمبی بات کرتی کبھی مختصر بات کر کے فون رکھ دیتی وہ پاکستان آکر بھی کسی سے رابطے میں نہیں تھی۔ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لمبی' بے مقصد خوش گپیاں جن کی وہ عادی تھی۔۔۔ فرق اگر صرف پڑا تھا تو یہ کہ یہاں وہ پابندی سے اور وقت پر اچھا کھانا کھانے کی عادی ہو گئی تھی کیونکہ یہ اس کی مجبوری تھی ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی اس کا خیال رکھتے تھے اور اتنا خیال رکھتے تھے کہ کبھی کبھی اسے احساس جرم ہونے لگتا کہ اسے ان کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا اس نے اس بڑھاپے میں ان کی ذمہ داری بڑھا دی تھی۔

پتا نہیں کتنے دن تھے جو اس نے اسی طرح گزارے تھے۔۔۔ سوتے جاگتے یا پھر کبھی وہ گھر سے بے مقصد نکل پڑتی۔۔۔ ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں اور سارے شہر میں گھومتی پھرتی۔۔۔ چلتی ہوئی گاڑی سے نظر آنے والے منظر اس کے ذہن کو وقتی طور پر بھٹکا دیتے تھے اس کی سوچ کو اس کی زندگی سے دوسروں کی زندگی پر لے جاتے تھے۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ گھر سے نکلی تھی اور نہر کے ساتھ سڑک پر چلتے چلتے وہ شہر سے ہی باہر نکل آئے تھے۔ ایک جگہ گاڑی رکوا کر وہ نیچے اتر آئی تھی اور نہر کے ساتھ سبزے پر نہر کے پانی پر بہتی بے کار چیزوں کو دیکھتے دیکھتے وہ اس کے ساتھ چلنے لگی تھی یوں جیسے وہ بھی پانی پر بہنے والی کوئی بے کار چیز تھی' پتا نہیں وہ کتنی دیر چلتی رہی تھی پھر ایک جگہ کھڑے ہو کر بہتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگی۔۔۔ گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں موسم سرما میں نہر میں بہتا ہوا وہ پانی برسات کے پانی کی طرح تیز رفتار نہیں تھا' نہ ہی پانی اتنا زیادہ تھا لیکن اس لمحے وہ اسے عجیب انداز میں اپنی طرف کھینچ رہا تھا یوں جیسے وہ اسے اپنے اندر اترنے کے لیے پکار رہا ہو۔۔۔ چند لمحوں کے لیے وہ اس خنکی کو بھی بھول گئی تھی جو اس کے سویٹر اور شال کے باوجود اس کے جسم کو شل کرنے لگی تھی۔ نہر کے دونوں کناروں پر لگے ہوئے اونچے لمبے درخت ہوا سے ہلتے تو ان کے پتوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر نہر کے پانی پر پڑتیں۔۔۔ لحظہ بھر کے لیے اسے روشن کرتیں غائب ہو جاتیں۔

بس صرف ایک لمحہ تھا جس نے اس سے کہا تھا کہ اسے اس پانی میں اترنا چاہیے۔ دیکھنا تو چاہیے وہاں آگے نیچے کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ قدم بڑھا دیتی' کسی عورت کی آواز پر وہ ٹھٹک گئی تھی۔

"یہ ذرا گٹھا تو بندھوا دے میرے ساتھ بیٹی!"

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ ایک ستر، اسی سالہ دبلی پتلی سانولی رنگت اور جھریوں سے بھرے چہرے والی ایک بوڑھی عورت تھی۔ جو ایندھن کے لیے وہاں درختوں کی گری ہوئی خشک لکڑیاں چننے کے بعد اب اسے ایک چادر نما کپڑے میں باندھنے کی کوشش میں اسے مخاطب کر رہی تھی، وہاں دور دور تک ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور وہ بھی کب اور کہاں سے یک دم نمودار ہوئی تھی امامہ کو اس کا اندازہ بھی نہیں ہوا۔ اس نے کچھ کہے بغیر نہر کے کنارے سے ہٹتے ہوئے اماں کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔ گٹھا اتنا بڑا بنا تھا کہ اسے یقین تھا کہ وہ بوڑھی عورت کبھی بھی اس گٹھے کو سر پر نہیں اٹھا پائے گی۔۔۔ لیکن اس بڑھیا نے امامہ کی مدد سے بڑے آرام سے وہ گٹھا سر پر اٹھا لیا تھا۔

"ذرا میری بکری کی رسّی مجھے پکڑانا۔" اس بوڑھی عورت نے اب دور ایک درخت کے دامن میں اگی گھاس چرتی ہوئی ایک بکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امامہ سے کہا تھا، امامہ کو ایک لمحے کے لیے تامل ہوا لیکن پھر اس نے جا کر تھوڑی بہت جدوجہد کے بعد اس بکری کی رسّی پکڑ ہی لی تھی۔

"آپ چلیں میں ساتھ چلتی ہوں کہاں جانا ہے آپ کو؟"

امامہ کو خیال آیا تھا کہ وہ اتنے بڑے لکڑیوں کے گٹھڑ کے ساتھ بکری کو کیسے تھامے گی۔

"بس یہ یہاں آگے ہی جانا ہے ادھر سڑک پار کر کے دوسری طرف۔" بوڑھی عورت نے نہر کے سبزے سے نکل کر سڑک کی طرف جاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے سمجھایا تھا۔

امامہ بکری کی رسّی کھینچتی ہوئی چپ چاپ اس عورت کے پیچھے چل پڑی تھی، جس کے پاؤں ننگے تھے اور ایڑیاں، کھردری اور پیدل چل چل کر پھٹ چکی تھیں، امامہ اونی جرابوں کے ساتھ بہت آرام دہ کورٹ شوز پہنے ہوئے تھی اس کے باوجود وہ اس بوڑھی عورت کی سبک رفتاری کا ساتھ نہیں کر پا رہی تھی جو یوں چل رہی تھی جیسے ٹائلز کے فرش یا کسی مخملیں قالین پر چل رہی ہو۔

سڑک پار کرتے ہی امامہ کو دس بیس کے قریب وہ جھگیاں نظر آ گئی تھیں، جنہیں اماں اپنا گھر کہہ رہی تھی، وہ جھگیاں بس ٹینٹوں پر مشتمل نہیں تھیں۔ لوگوں نے اپنی جھگی کے گرد سرکنڈوں کی دیواریں کھڑی کر کر کے جیسے احاطے سے بنا لیے تھے جن کے فرش کو مٹی اور گارے سے لیپا ہوا تھا۔ وہ کچھ تامل کے ساتھ ایسی ہی ایک جھگی کے احاطے میں بکری کی رسی پکڑے اماں کے پیچھے چلتی ہوئی داخل ہوئی تھی۔

اس بوڑھی عورت نے احاطے کے ایک کونے میں سر پر لادا ہوا گٹھر اتار پھینکا تھا اور پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھے جیسے اس نے گہرے سانس لیتے ہوئے اپنی سانس بحال کی تھی۔ بکری تب تک امامہ کے ہاتھ سے رسّی چھڑا کر سرکنڈوں کی دیوار کے ساتھ اس جگہ پہنچ گئی تھی جہاں اسے باندھا جاتا تھا اور جہاں زمین پر کچھ مرجھائی ہوئی گھاس پھونس پڑی تھی وہ اب اس پر منہ مارنے لگی تھی۔

احاطے کے ایک دوسرے حصے میں مٹی کے ایک چولہے پر مٹی کی ایک ہنڈیا چڑھی ہوئی تھی جس سے اٹھنے والی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، احاطہ روپہلی دھوپ سے روشن اور گرمایا ہوا تھا۔ وہاں نہر والی ٹھنڈک نہیں تھی ایک آسودہ سی حرارت تھی۔ وہ جیسے کسی گرم آغوش میں آ گئی تھی۔

بوڑھی عورت تب تک لکڑیوں کا گٹھڑ کھول کر اس میں سے کچھ لکڑیاں نکال کر چولہے کی طرف آ گئی تھی۔

"ارے تو کھڑی کیوں ہے اب تک۔۔۔ بیٹھ کر دم تو لے۔۔۔ میری خاطر کتنا چلنا پڑ گیا تجھے۔۔۔ میں نے کہا بھی تھا میں لے جاتی ہوں بکری کو۔۔۔ میرا تو روز کا کام ہے۔۔۔ پیدا ہوتے سے کرتی آئی ہوں محنت مشقت۔۔۔ پر تو تو شہر کی کڑی ہے۔ تجھ سے کہاں ہوتی ہے کوئی مشقت۔"

اس نے کہتے ہوئے چولہے سے کچھ فاصلے پر پڑی ایک چوکی کو جیسے اس کے لیے آگے کھسکا دیا تھا۔

"میں بھی مشقت ہی کاٹتی آئی ہوں اماں! یہ مشقت تو کچھ بھی نہیں۔"

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

امامہ اس سے کہتے ہوئے آگے بڑھ آئی تھی۔ اس کا خیال تھا بوڑھی عورت نے اس کی بات نہیں سنی ہوگی لیکن وہ بوڑھی عورت ہنس پڑی تھی۔

"بس مجھے مشقت نہیں لگتی مجھے لگتی ہے' یہی تو فرق ہے۔۔۔ پر تیرا قصور نہیں سارا فرق جوانی کا ہے۔۔۔ جوانی میں ہر چیز مشقت لگتی ہے۔۔۔ بڑھاپا خود ایسی مشقت ہے کہ باقی مشقتیں چھوٹی بنا دیتا ہے۔"

اس عورت نے اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کہا تھا امامہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی وہ اس حلیے اور اس جگہ رہنے والی عورت سے ایسی بات کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

"آپ پڑھی لکھی ہیں؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"بہت زیادہ۔" وہ عورت اس بار بھی چولہے ہی کی طرف متوجہ تھی اور اس بار بھی اس نے بات ہنس کر ہی کہی تھی مگر لہجے میں تمسخر تھا اپنے لیے۔۔۔ جو امامہ تک پہنچ گیا تھا۔ امامہ نے اگلا سوال نہیں کیا تھا وہ اب اس ہانڈی اور چولہے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی جس کے پاس وہ بوڑھی عورت بیٹھی تھی اینٹوں سے بنے مٹی کے چولہے پر رکھی رکھی ہوئی پرانی مٹی کی ہنڈیا۔ میں ساگ اپنے پانی میں گل رہا تھا۔ اس بوڑھی عورت نے نہر کے کنارے سے چنی ہوئی جھاڑیاں توڑ توڑ کر چولہے میں پھینکنا شروع کر دیا۔ وہ آگ کو اسی طرح بھڑکائے رکھنے کی کوشش تھی۔

امامہ مٹی سے لیپے ہوئے گرم فرش پر چولہے کے قریب آکر بیٹھ گئی تھی۔ پاؤں سے جرابیں اور جوتے اتار کر اس نے اپنے سرد اور سوجے ہوئے پیروں کو دھوپ سے گرم فرش پر جیسے کچھ حدت پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

اماں اس عمر میں بھی پنجوں کے بل بیٹھی لکڑیوں کو توڑ مروڑ کر چولہے میں جھونک رہی تھی۔ آگ میں لکڑیوں کے تڑخنے اور چٹخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ساگ کی ہانڈی سے اٹھتی بھاپ اور اس میں پڑتے ابال دیکھتی رہی۔

"آدمی کیا کرتا ہے تیرا؟" وہ اماں کے اس اچانک کیے ہوئے سوال پر چونکی پھر بڑبڑائی۔

"کیا کرتا ہے؟" اس نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی تھی پھر کہا۔ "کام کرتا ہے۔"

"کیا کام کرتا ہے؟" اماں نے پھر پوچھا۔

"باہر کام کرتا ہے۔" وہ ساگ کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"پردیس میں ہے؟" بوڑھی عورت نے جواباً کہا۔ وہ بھی اب اسی کی طرح زمین پر بیٹھ گئی تھی اور اس نے اپنے گھٹنوں کے گرد اس کی طرح بازو لپیٹ لیے تھے۔

"ہاں پردیس میں ہے۔" وہ اسی طرح ساگ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"تو تو یہاں کس کے پاس ہے؟ سسرال والوں کے پاس؟"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"میں کسی کے پاس نہیں ہوں۔" ساگ پر نظریں جمائے اس نے بے ربط جواب دیا۔

"آدمی نے گھر سے نکال دیا ہے کیا؟" اس نے چونک کر اس عورت کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں!"

"پھر تو بھگا کے آئی ہے کیا؟"

"نہیں۔" اس نے بے ساختہ سر ہلایا۔

"تو پھر یہاں کس لیے آئی ہے؟"

"سکون کے لیے۔" اس نے بے اختیار کہا۔

"سکون کہیں نہیں ہے۔" وہ اس عورت کا چہرہ دیکھنے لگی۔

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تو جو چیز دنیا میں ہے ہی نہیں اسے دنیا میں کیا ڈھونڈنا؟" اس نے حیرت سے اس عورت کو دیکھا۔ وہ گہری بات تھی اور اس عورت کے منہ سے سن کر اور بھی گہری لگی تھی اسے جو اس جھگی میں بیٹھی آگ میں لکڑیاں جھونک رہی تھی۔

"پھر بندہ رہے کیوں دنیا میں اگر بے سکون رہنا ہے؟" وہ اس سے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہتی تھی جو اس نے پوچھا تھا۔

"تو پھر کہاں رہے؟" لکڑیاں جھونکتی اس عورت نے ایک لحظ کے لیے رک کر اسے دیکھتے ہوئے ڈائریکٹ پوچھا' وہ کچھ لاجواب ہوتے ہوئے دوبارہ ساگ کو دیکھنے لگی۔

"تیرا آدمی کہتا نہیں واپس آنے کو؟"

"پہلے کہتا تھا۔ اب نہیں کہتا۔" اس نے خود بھی لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے آگ میں پھینکنے شروع کر دیے تھے۔

"بے چارہ اکیلا ہے وہاں؟"

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی۔ "ہاں۔" اس نے اس بار مدھم آواز میں کہا۔

وہ بوڑھی عورت اب پلاسٹک کے ایک شاپر میں پڑا ہوا آٹا ایک تھالی میں ڈال رہی تھی۔

"تو اکیلا چھوڑ کر آ گئی اسے؟" دھوپ میں پڑے ایک گھڑے سے ایک گلاس میں پانی نکالتے ہوئے اماں نے جیسے افسوس کیا تھا۔ وہ بے مقصد آگ میں لکڑیاں پھینکتی رہی۔

"تجھ سے پیار نہیں کرتا تھا؟"

وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئی۔

"کرتا تھا۔" اس کی آواز بے حد مدھم تھی۔

"خیال نہیں رکھتا تھا؟" ساگ سے اٹھتی بھاپ اس کی آنکھوں میں اترنے لگی تھی' اسے بڑے عرصے کے بعد پتا نہیں کیا کیا یاد آیا تھا۔

"رکھتا تھا۔" آواز اور بھی مدھم ہو گئی تھی۔

اماں اب اس کے پاس بیٹھی اس تھالی میں دو روٹیوں کا آٹا گوندھ رہی تھی۔

"روٹی کپڑا نہیں دیتا تھا؟" اس نے چادر سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

"دیتا تھا۔" وہ اپنی آواز خود بھی بمشکل سن پائی تھی۔

"تو نے پھر بھی چھوڑ دیا اسے؟ تو نے بھی اللہ سے بندے والا معاملہ کیا اس کے ساتھ۔ سب کچھ لے کر بھی دور ہو گئی اس سے۔"

اماں نے آٹا گوندھتے ہوئے جیسے ہنس کر کہا تھا۔ وہ بول نہیں سکی تھی۔ بولنے کے لیے کچھ تھا نہیں۔ پلکیں جھپکے بغیر وہ صرف اماں کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"تجھے یہ ڈر بھی نہیں لگا کہ کوئی دوسری عورت لے آئے گا وہ؟"

"نہیں۔" اس بار آٹا گوندھتے اماں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"تجھے پیار نہیں ہے اس سے؟" کیا سوال آیا تھا! وہ نظریں چرا گئی۔ اس کی چپ نے اماں کو جیسے ایک اور سوال دیا۔

"کبھی پیار کیا ہے؟" آنکھوں میں سیلاب آیا تھا۔ کیا کیا یاد نہیں آ گیا تھا۔

"کیا تھا۔" اس نے آنسوؤں کو بہنے دیا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" اماں نے اس کے آنسوؤں کو نظر انداز کر دیا تھا۔

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

"نہیں ملا۔" سر جھکائے اس نے آگ میں کچھ اور لکڑیاں ڈالیں۔

"ملا نہیں یا اس نے چھوڑ دیا؟" اس کے منہ میں جیسے ہری مرچ آئی تھی۔

"اس نے چھوڑ دیا۔" پتا نہیں ساگ ہانڈی میں زیادہ پانی چھوڑ رہا تھا۔ یا اس کی آنکھیں، پر آگ دونوں جگہ تھی۔

"پیار نہیں کرتا ہوگا۔" اماں نے بے ساختہ کہا۔

"پیار کرتا تھا لیکن انتظار نہیں کر سکتا تھا۔" اس نے پتا نہیں کیوں اس کی طرف سے صفائی دی تھی۔

"جو پیار کرتا ہے وہ انتظار کرتا ہے۔" جواب کھٹاک سے آیا تھا اور اس کی ساری وضاحتوں، دلیلوں کے پرخچے اڑا گیا تھا۔ وہ روتے ہوئے ہنسی تھی، یا پھر شاید ہنستے ہوئے روئی تھی۔ کیا سمجھا دیا تھا اس عورت نے جو دل دماغ کبھی سمجھا نہیں سکے تھے اسے۔

"اس آدمی کی وجہ سے گھر چھوڑ آئی اپنا؟" اماں نے پھر پوچھا۔

"نہیں... بس وہاں بے سکونی تھی مجھے، اس لیے آگئی۔" اس نے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

"کیا بے سکونی تھی؟" وہ برستی آنکھوں کے ساتھ بتاتی گئی۔

اماں چپ چاپ آٹا گوندھتی رہی اس کے خاموش ہونے پر بھی اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ خاموشی کا وہ وقفہ بڑا طویل ہو گیا تھا۔ بے حد طویل، اماں آٹا گوندھنے کے بعد رکھ کر ساگ میں ڈوئی چلانے لگی تھی... وہ ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے ساگ کو گھلتے دیکھتی رہی۔

"وہاں نہر کے کنارے کیوں کھڑی تھی؟" اماں نے یک دم ساگ گھوٹتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس نے سر اٹھا کر اماں کو دیکھا۔

"بہت بزدل ہوں اماں... مرنے کے لیے نہیں کھڑی تھی۔"

نم آنکھوں کے ساتھ اس نے جیسے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اس بوڑھی عورت سے پوچھا تھا، اسے جیسے اب سمجھ میں آیا تھا وہ وہاں سے اسے یہاں تک کیوں لے آئی تھی۔ اس کے ہنسنے پر جیسے وہ بھی مسکرائی تھی اس کے خستہ حال بوسیدہ دانت دکھے تھے۔

"یعنی تو تو بڑی بہادر ہے۔ میں نے بزدل سمجھا... تُو تو میرے سے بھی بہادر ہے پھر۔"

"نہیں، آپ سے بہادر تو نہیں ہوں میں، میں تو بے حد کمزور ہوں۔ اس بکری سے بھی کمزور جس کو گھیر کے لائی ہوں۔" امامہ نے کہا تھا۔

"تجھے اپنی ہونے والی اولاد کا بھی خیال نہیں آتا؟ پیار نہیں آتا اس پر؟" اس کی آنکھیں ایک بار پھر برسنے لگی تھیں۔

"کوئی اس طرح گھر، آدمی چھوڑتا ہے جیسے تُو چھوڑ آئی۔ مرجاتے ہیں بڑے بڑے پیارے مرجاتے ہیں، پر کوئی ایک پیارے کے مرنے پر باقیوں کو چھوڑ دیتا ہے؟"

برستی آنکھوں کے ساتھ امامہ نے اس کی باتیں سنیں، وہ وہی کچھ کہہ رہی تھی جو اس سے کوئی بھی پوچھتا کوئی بھی کہہ دیتا مگر وہ کسی کو وہ جواب نہیں دیتی تھی جو اس نے اس وقت اس عورت کو دیا تھا جس سے اس کی جان پہچان تک نہ تھی۔ بعض دفعہ انسان دل کا وہ بوجھ جو اپنوں کے سامنے ہلکا نہیں کرتا غیروں کے سامنے کر دیتا ہے۔ وہ بھی وہاں جہاں اسے یقین ہو وہ راز دار رہے گا۔ کبھی نکل کر نہیں آئے گا۔

"میں اب کسی سے پیار نہیں کرنا چاہتی اماں۔"

بوڑھی عورت نے ساگ کا ڈھکنا اٹھا کر پھر ڈوئی چلائی۔

"مجھے لگتا ہے جس سے بھی میں پیار کرتی ہوں، وہ مجھ سے چھن جاتا ہے... وہ چیز میرے پاس نہیں رہتی۔ تو پھر

PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کیوں اس تکلیف سے گزروں میں بار بار' کیوں میں زندگی میں ایسے رشتے رکھوں جن سے بچھڑنا مجھے اتنی تکلیف دے۔"

اس نے جیسے روتے ہوئے اس بوڑھی عورت کے سامنے سینے کی وہ پھانس نکالی تھی جس نے اس کا سانس روک رکھا تھا۔

"بار بار پیار کروں... بار بار گنوادوں... میں اب اس تکلیف سے نہیں گزر سکتی۔"

وہ روتی جارہی تھی۔ آنسو یوں نکل رہے تھے جیسے آبلوں کا پانی پتا نہیں بوڑھی عورت کی آنکھوں میں ساگ کی بھاپ نے پانی چھوڑا تھا یا اس کے درد نے لیکن اس نے بھی اپنی خستہ حال میلی کچیلی چادر کے پلو سے اپنی آنکھیں رگڑنا شروع کردی تھیں۔

"یہ تو نہیں کرسکتی' یہ کوئی انسان بھی نہیں کرسکتا کہ اپنوں کو اس لیے چھوڑ دے تاکہ ان کے بچھڑنے کی تکلیف سے بچ جائے ایک ایک کرکے بچھڑ رہے ہیں تو درد جھیل نہیں پارہی۔ سب کو اکٹھا چھوڑ کر درد جھیل لے گی؟" اس نے جو بات اس سے پوچھی تھی اس کا جواب امامہ کے پاس نہیں تھا... اور اگر تھا بھی تو وہ اس جواب کو دہرانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

"اس جھگی کے اندر میرا 38 سال کا جوان بیٹا ہے... ٹھہرو ذرا میں لے کر آتی ہوں اسے' تمہاری باتوں میں تو بھول ہی گئی تھی میں اسے..."

وہ بوڑھی عورت یک دم اٹھ کر اندر چلی گئی تھی چند منٹوں کے بعد وہ ایک ریڑھی نما ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی باہر لائی جس میں ایک دبلا پتلا مرد ایک بستر پر لیٹا ہوا قہقہے لگا رہا تھا یوں جیسے وہ ماں کی توجہ ملنے پر خوش تھا۔ اس عورت نے اگر اسے یہ نہ بتایا ہوتا کہ اس کی عمر 38 سال تھی تو امامہ اسے 20-18 سال کا کوئی لڑکا سمجھتی... وہ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے معذور تھا۔ بات بھی ٹھیک سے نہیں کرپاتا تھا بس اس بوڑھی عورت کو دیکھ کر ہنستا تھا اور وہ اسے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

اس نے ریڑھی لاکر امامہ کے قریب کھڑی کردی تھی اور خود روٹی پکانے بیٹھ گئی تھی۔

"میرا اکلوتا بیٹا ہے... 38 سال میں نے اس کے سہارے گزارے ہیں اللہ کے سہارے کے بعد۔" وہ پیڑا بناتے ہوئے اسے بتانے لگی تھی۔ "کوئی اور اولاد نہیں آپ کی؟" اس کے آنسو تھمنے لگے تھے۔

"پانچ بیٹے پیدا ہوئے تھے سب صحت مند... پر دنوں میں ختم ہوگئے پھر یہ پیدا ہوا تو شوہر نے کہا اسے کسی درگاہ پر چھوڑ آتے ہیں میں نہیں پال سکتا ایسی اولاد کو... بڑی ذمہ داری ہے پر میں کیسے چھوڑ دیتی اپنی اولاد... مجھے تو پیار ہی بڑا تھا اس سے۔"

بوڑھی عورت نے روٹی اب اس توے پر ڈال دی تھی جس سے کچھ دیر پہلے اس نے ساگ کی ہنڈیا اتاری تھی۔ وہ اب اپنے بیٹے کو یوں پچکار رہی تھی جیسے وہ اڑتیس سال کا نہیں آٹھ ماہ کا تھا اور وہ بھی اس ریڑھی کے اندر ماں کے پچکارنے پر اپنے نحیف، نزار اعضا کو اسی طرح سکیڑ رہا تھا کھلکھلاتے ہوئے جیسے واقعی کوئی ننھا بچہ تھا۔

"شوہر دو چار سال سمجھاتا رہا مجھے پر میں نہیں مانی۔ اللہ نے دی تھی اولاد... اللہ کی دی چیز کیسے پھینک آتی۔ انسان کی دی ہوئی چیز ہوتی تو پھینک آتی۔ کوئی اور بچہ نہیں ہوا اس کے بعد میرے ہاں۔ شوہر کو بڑا پیار تھا مجھ سے پر اسے اولاد بھی چاہیے تھی۔ میرا بھی دل چاہتا تھا خود ہی نکل آؤں اس کی زندگی سے۔ پر میرے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اس لیے وہیں بیٹھی رہی' دوسری شادی سے دس دن پہلے کھیتوں میں اسے سانپ لڑ گیا۔ لوگ کہتے تھے میری آہ پڑی ہے۔ پر میں نے تو کوئی بددعا کبھی نہیں دی اس کو۔ میں تو خوش ہی رہی جب تک اس کے ساتھ رہی۔"

اماں کی آنکھوں میں پانی آیا تھا پر وہ دوپٹے سے رگڑ کر۔ توے پر پھولتی ہوئی روٹی سینکنے لگی۔



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

"وہ مر گیا تو ساری زمین، جائیداد رشتہ داروں نے چھین لی۔ بس بیٹا میرے پاس رہنے دیا۔ یہ ٹھیک ہوتا تو یہ بھی چھین لیتے وہ۔ پر مولا کا کرم تھا یہ ایسا تھا۔ اڑتیس سال سے اس کا اور میرا ساتھ ہے اس کو شوہر کے کہنے پر درگاہ پر چھوڑ آئی ہوتی تو میرا کیا ہوتا۔"

اماں نے روٹی عجیب خوشی اور سرشاری کے عالم میں اس کے سامنے رکھی تھی۔ کوئی بوجھ تھا جو امامہ کے کندھوں سے ہٹ رہا تھا کوئی قفل تھا جو کھل رہا تھا کوئی سحر تھا جو ٹوٹ رہا تھا۔

"جو چھوڑا اللہ دے اس پر صبر کر اور خود کسی کو چھوڑا نہ دے۔ اللہ پسند نہیں کرتا یہ۔"

اس عورت نے روٹی پر ساگ ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"غم بہت بڑا تھا میرا اماں۔" اس نے کہے بغیر سر جھکائے پہلا لقمہ توڑا۔

"اللہ نے تجھے غم دیا تو نے اپنے آدمی کو۔ تو نے اپنا غم کون سا اپنے اندر رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔"

وہ لقمہ ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی، منہ میں نہیں ڈال سکی، آنکھیں پھر دھندلائی تھیں۔ اسے سالار یاد آیا تھا۔ ہاتھ پر اس کا محبت بھرا لمس یاد آیا تھا۔ اسکی محبت اس کی عنایات یاد آئی تھیں۔ اور اس اولاد کا خیال آیا تھا جسے اس نے بھی بڑی دعائیں کر کر کے مانگا تھا اور جب دعا پوری ہو گئی تھی تو وہ کسی بھی چیز کی قدر نہیں کر رہی تھی۔

اس بوڑھی عورت کے احاطے میں بیٹھے اسے پہلی بار وسیم پر صبر آیا تھا۔ سعد پر صبر آیا تھا وہ اس دن وہاں سے اٹھ کر بھاگی تھی۔ اسے اب گھر جانا تھا سالار کے پاس اور واپس گھر آ کر اس نے خود سالار کو فون کر کے واپس آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ حیران ہوا تھا شاید حیران سے زیادہ پریشان ہوا تھا مگر اس نے اس کی ٹکٹ کنفرم کروا دی تھی۔

وہ جانے سے پہلے ایک بار پھر اس بوڑھی عورت سے ملنے آئی تھی اس کے لیے کچھ چیزیں لے کر اسے بے حد کوشش کے باوجود وہ جھگی نہیں ملی تھی۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ آدھا دن نہر کے اس کنارے اس جھگیوں والے علاقے کو ڈھونڈتی رہی تھی۔ ڈرائیور نے وہ علاقہ خود نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ اس دن وہ اسے بہت پیچھے چھوڑ کے نہر کنارے اتری تھی اور پھر وہاں سے پیدل ہی واپس آئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ جگہ وہیں ہونی چاہیے تھی۔ اسی سڑک پر کہیں۔ مگر وہاں وہ جھگیاں نہیں تھیں نہ وہ بوڑھی عورت۔ جس کے ہاتھ کی روٹی اور ساگ کا سواد اسے ابھی بھی اپنی زبان پر محسوس ہوتا تھا۔ نہ وہ اڑتیس سال کی اولاد کی مشقت۔ جس نے اس بوڑھی عورت کے لیے ہر بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔ اور نہ اس بہت زیادہ پڑھی لکھی عورت کی باتیں۔ جس نے چابیوں کی طرح اس کے وجود کے قفل اور گتھیاں کھول کر اسے آزاد کیا تھا۔

جبرئیل سکندر اپنی پیدائش سے بھی پہلے اپنی ماں کے بہت سے رازوں کا امین تھا۔

امریکہ کے اس اسپتال کی نیورو سرجری ڈیپارٹمنٹ کے آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر جس شخص کا دماغ کھولے بیٹھے تھے۔ وہ آبادی کے اس 2.5 فیصد سے تعلق رکھتا جو 150 آئی کیو لیول رکھتے تھے اور اس آئی کیو لیول کے ساتھ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

وہ آپریشن آٹھ گھنٹے سے ہو رہا تھا اور ابھی مزید کتنی دیر جاری رہنا تھا یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ ڈاکٹرز کی اس ٹیم کو لیڈ کرنے والا ڈاکٹر دنیا کے قابل ترین سرجن میں سے ایک مانا جاتا تھا۔ آپریشن تھیٹر سے منسلک ایک کلاس روم میں نیورو سرجری کے ایڈپرنٹس اس وقت جیسے سحر زدہ معمول کی طرح اس ڈاکٹر کے چلتے ہوئے ہاتھوں کو بڑی اسکرین پر دیکھ رہے تھے۔ جو اس کھلے ہوئے دماغ پر یوں کام کر رہا تھا جیسے کوئی پیانسٹ کی انگلیاں ایک پیانو پر، وہ اپنی مہارت سے سب کو مسمرائز کیے ہوئے تھا سوائے اس ایک شخص کے۔ جس کی زندگی اور موت اس وقت اس کے ہاتھ میں تھی۔

PAKSOCIETY.COM

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں ان شاء اللہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

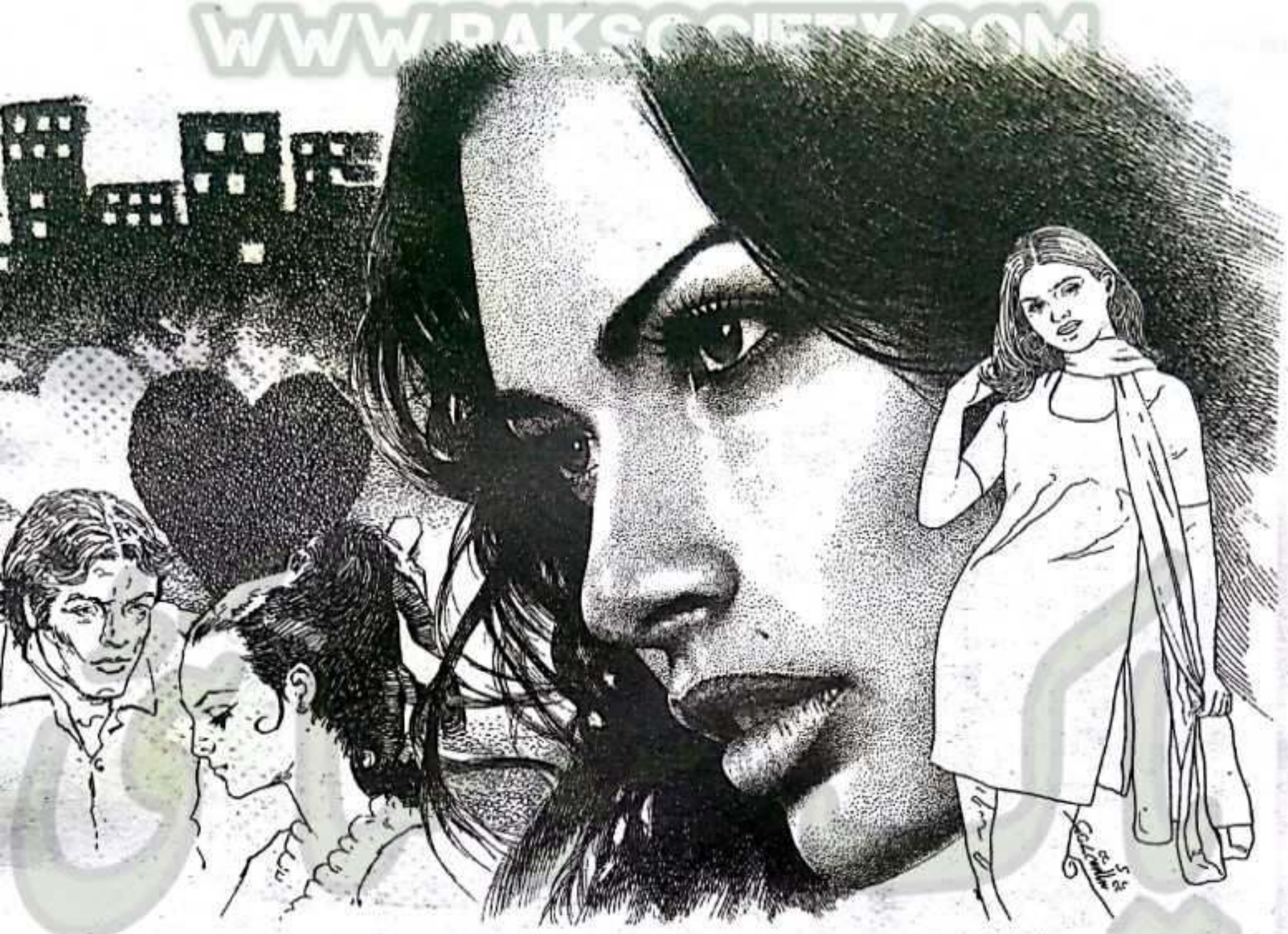

عمیرہ احمد

# آب حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص — سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سرا مل جاتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

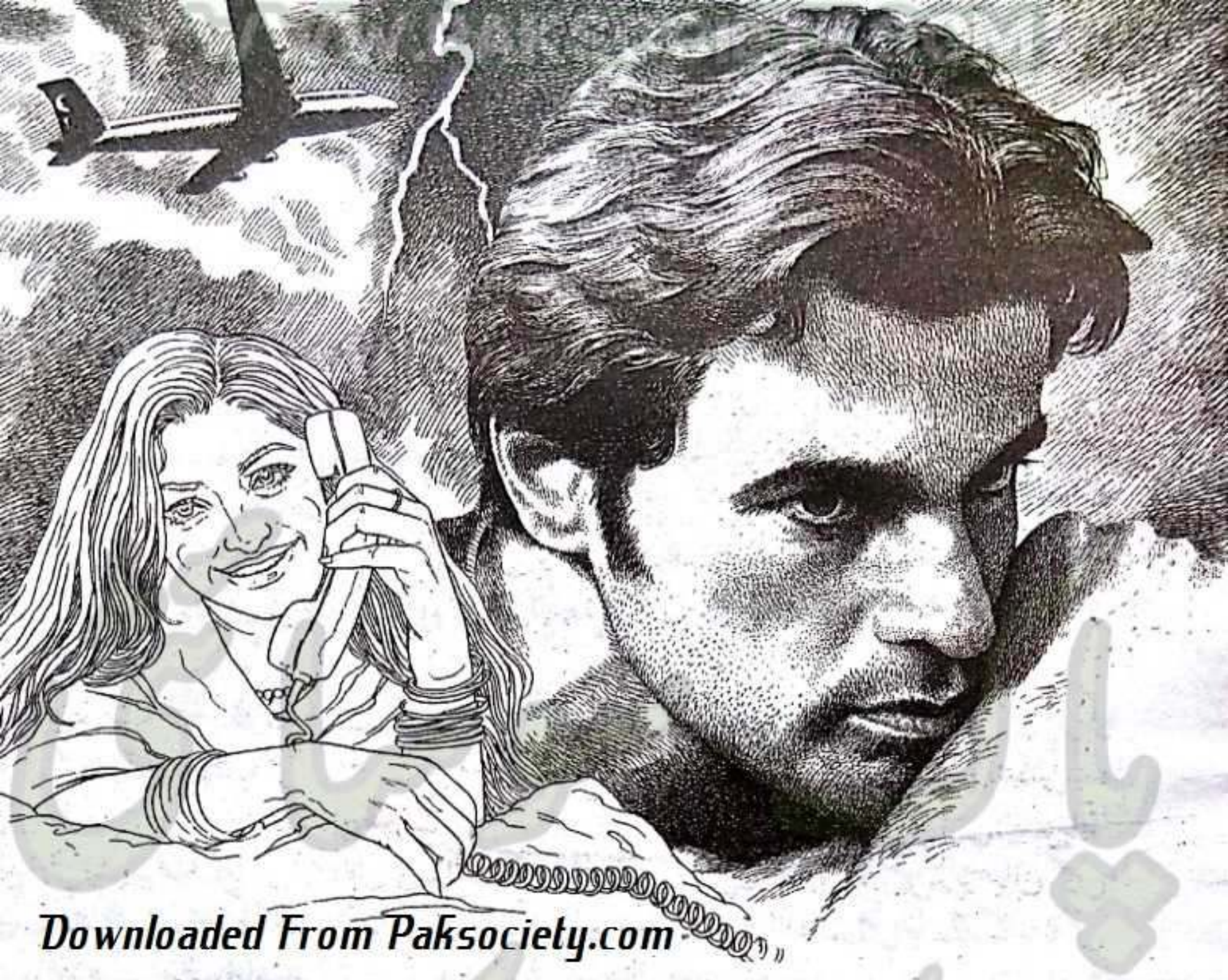

Downloaded From Paksociety.com

J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی، اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

www.Paksociety.com



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

# حاصل و محصول

واشنگٹن میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں وہ سالار سکندر کی پہلی میٹنگ اور پریزنٹیشن نہیں تھی۔ وہ سینکڑوں بار نہیں تو درجنوں بار وہاں آچکا تھا مگر اپنی زندگی میں وہ کبھی کسی بورڈ روم میں دماغ پر اتنا بوجھ لے کر نہیں بیٹھا تھا جتنا اس دن بیٹھا تھا۔

وہ جہاز میں اپنی فلائٹ کے دوران دو گھنٹے سویا تھا اور باقی کا وقت اس نے لیپ ٹاپ پر اس پریزنٹیشن کو بار بار دیکھتے اور اس میں تبدیلیاں اور اضافے کرتے گزارا تھا' جو وہ اس میٹنگ میں پیش کرنے آیا تھا۔ وہ اس پریزنٹیشن کے شان دار ہونے کے باوجود یہ جانتا تھا وہ ایک ہارا ہوا کیس ایک ایسی جیوری کے سامنے پیش کرنے جا رہا تھا جو اس کیس کے حوالے سے تصویر کا کوئی دوسرا رخ دیکھنے پر تیار نہیں ہونے والی تھی' کیوں کہ تصویر کا وہ دوسرا رخ بے حد بھیانک تھا لیکن بھیانک ہونا اس سے نظریں چرانے کی وجہ نہیں تھی' بلکہ اس بھیانک رخ میں نظر آنے والا اپنا عکس تھا جو ان عالمی طاقتوں کے نمائندوں کے ضمیر کو سلانے کا باعث بن رہا تھا۔ سالار سکندر کو سانپوں کے بل میں بیٹھ کر ان کا زہر نکالنے کی تجویز پیش کرنی تھی' اور اسے اپنی کامیابی کے بارے میں کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں تھی۔

اس کی فلائٹ واشنگٹن میں جس وقت پہنچی' اس کے ٹھیک چار گھنٹے کے بعد ورلڈ بینک کے "دربار" میں اس کی حاضری تھی۔ وہ ایک بار پھر ہوٹل کے کمرے میں سوئے بغیر کاغذات کا وہ پلندہ دیکھتا رہا جو اسے اس پریزنٹیشن کے ساتھ بورڈ روم میں تقسیم کرنا تھے۔ ان کاغذات کے ڈھیر کو وہ اگر کسی کورٹ میں پیش کر دیتا تو وہ کیس جیت جاتا' لیکن سوال وہاں یہ تھا کہ دنیا میں ایسی کون سی عدالت تھی جو اس کیس کو سنتی.... کاٹکو کی عدالتیں ریڑھیاں تھیں' جن سے کچھ بھی خریدا جا سکتا تھا.... انصاف کے سوائے.... ایبا کا عالمی عدالت انصاف میں جانے کے وسائل نہیں رکھتا تھا.... انصاف ملنا نہ ملنا تو خیر دور کی بات تھی.... اور سالار سکندر ورلڈ بینک میں کام کرتا تھا' وہ اپنے پروفیشنل معاملات کو خفیہ رکھنے کا پابند تھا.... اور ان سب حالات میں صرف ایک میڈیا تھا جس کا گلا گھونٹنے کی ورلڈ بینک کوشش میں تھا' کیوں کہ وہ پیٹرس ایبا کا کی آخری امید تھا اور سالار کو پتا تھا ایبا کا کسی بھی حد تک جا سکتا تھا' ان جنگلات کی تباہی کو روکنے کے لیے' جو اس کے قبیلے کی بقا کے ضامن تھے' لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ پیٹرس ایبا کا کو اس کام سے روکنے کے لیے "مہذب دنیا" بھی کسی حد بھی تک جا سکتی تھی۔ اسے یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ پیٹرس ایبا کا اس وقت نیویارک کے ایک اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس بورڈ روم کا ماحول ویسا نہیں تھا جیسا اس نے ہمیشہ دیکھا تھا۔ سنجیدگی ہر بورڈ کا حصہ ہوتی تھی' لیکن جو اس نے اس دن وہاں دیکھی تھی' وہ سنجیدگی نہیں تھی وہ سرد مہری تھی اور وہ سرد مہری بورڈ روم میں بیٹھے صرف کسی ایک یا دو لوگوں کے انداز اور حرکات و سکنات سے نہیں جھلک رہی تھی.... وہاں اس بورڈ روم میں بیٹھے سات کے سات لوگوں کے چہروں اور آنکھوں میں ایک جیسی ٹھنڈک اور سرد مہری تھی۔ ایسی سرد مہری جو کسی کمزور اعصاب کے انسان کو حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھی.... بے تاثر چہرے' دوسرے کے اوسان خطا کر دینے والی نظریں.... کسی دوستانہ مسکراہٹ سے عاری بھنچے ہوئے لب.... جن پر اگر کبھی کوئی مسکراہٹ آتی بھی تو وہ ایک تضحیک آمیز اور توہین آمیز خم سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا تھا جو پل بھر رہ کر غائب ہو جاتا تھا۔

ایک بیضوی شکل کی میز کے گرد ٹانگوں پر ٹانگیں رکھے وہ پانچ مرد اور دو عورتیں اس کام کے ماہر تھے جو اس وقت کر رہے تھے.... وہ ورلڈ بینک کے سالار سکندر جیسے کئی "باضمیر" ایمپلائز کا دھڑن تختہ کر چکے تھے جنہیں زندگی میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

تحفظ فراہم کبھی بیٹھے بٹھائے ورلڈ بینک میں کام کرتے کرتے پروفیشنل ethics (اخلاقیات) کا دورہ پڑتا انسانیت یاد آنا شروع ہو جاتی۔۔۔ سالار سکندر ان کے سامنے کیا شے تھا۔ کم از کم اس میٹنگ کے آغاز سے پہلے وہ یہی سوچ کر آئے تھے۔ اجتماعی طور پر ان کی حکمت یہ نہیں بھی تھی تو بھی انفرادی طور پر ان کا طریقہ کار یہی تھا۔

وہ واشنگٹن ڈی سی میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے وہ لوگ تھے جو سمجھتے تھے وہ سرخاب کے پروں کے ساتھ پیدا ہوئے تھے اور ورلڈ بینک کے ساتھ ان کی کئی سالوں پر مشتمل ایسوسی ایشن اور ان کا کام ان کے اس ذہنی خلل کو اگر بڑھاتا جاتا تھا تو غلط بھی نہیں تھا۔۔۔ سالار سکندر اس آرگنائزیشن میں واحد ذہین اور قابل شخص نہیں تھا وہاں بڑے بڑے طرم خان بیٹھے تھے جو اپنے کئی دہائیوں کے تجربے اور قابلیت سے کسی کے بھی پرخچے اڑا سکتے تھے۔۔۔ واشنگٹن آنے سے پہلے سالار سکندر کو اندازہ تھا وہ کیا بھگتنے جا رہا تھا۔ اس بورڈ روم کے اندر لیکن جس کے بارے میں اسے اندازہ نہیں تھا وہ بورڈ روم سے باہر پیش آنے والے حالات اور واقعات تھے۔

وہ سات لوگ سالار سکندر کے کیریئر کے حوالے سے ایک ایک چیز جانتے تھے اور اتنی ہی معلومات وہ ان کے بارے میں رکھتا تھا۔ ان میں سے کسی کو کسی کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ سالار سکندر نے میٹنگ کے آغاز میں اس میٹنگ کی سربراہی کرنے والے ہیڈ کے ابتدائی کلمات بڑے تحمل سے سنے تھے۔ وہ سالار سکندر کی نااہلی، کوتاہیوں اور ناکامیوں کو ڈسکس کر رہا تھا۔ سالار نے باقی چھ لوگوں کی نظریں خود پر جمی محسوس کیں۔ وہ ایک چارج شیٹ تھی جو اس پروجیکٹ کا ذکر کرتے ہوئے وہ مائیکل فرینک اس پر لگا رہا تھا۔ سالار بھی اتنے ہی بے تاثر چہرے کے ساتھ ان الزامات کو سنتا رہا۔۔۔ اس میٹنگ کا ایجنڈا یہ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود سالار کے لیے وہ سب الزامات غیر متوقع نہیں تھے۔

"میں ان میں سے کسی بھی بات کا جواب دینے سے پہلے اس پروجیکٹ کے حوالے سے ایک پریزنٹیشن دینا چاہتا ہوں کیوں کہ میرا خیال ہے یہ پریزنٹیشن ان میں سے بہت سارے سوالات اور اعتراضات کا جواب دے دے گی، جو آپ لوگ مجھ پر کر رہے ہیں۔"

سالار نے مائیکل کے ابتدائی کلمات کے بعد اس کے کسی الزام کا جواب دینے کے بجائے کہا تھا۔ ان سات افراد میں سے کسی نے اسے اس پریزنٹیشن کو پیش کرنے سے روکا نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی نے اس پریزنٹیشن کی نوعیت اور مقصد جاننے میں دلچسپی بھی نہیں لی تھی۔

سالار ایک کے بعد ایک سلائیڈ پروجیکٹر پر دکھاتا گیا۔ اس میں بہت سارے حقائق اور اعداد و شمار تھے اور اس کی اپنی ذاتی تحقیق بھی۔۔۔ وہ ان تمام چیزوں کو ان سلائیڈز کے ذریعے دکھا رہا تھا۔ ورلڈ بینک کے تعاون سے اگر وہ منصوبہ توڑ چڑھ جاتا تو افریقہ کی جنگلی حیاتیات کے ساتھ ساتھ پگمیز کی ممکنہ تباہی کے حوالے سے ہولناک اعداد و شمار۔۔۔ ورلڈ بینک کے چارٹر کی کون کون سی شقوں کی خلاف ورزی اس پروجیکٹ کے ذریعے ہو رہی تھی۔ ان جنگلات میں کام کرنے والے کمپنیز کی طرف سے کانگو کی مقامی آبادی کے استحصال کے ڈاکومینٹری ثبوت۔۔۔ اور انٹرنیشنل ڈونر کمپنیز اور این جی اوز کے خدشات پر مشتمل رپورٹس کے حوالے۔۔۔ اس کی پریزنٹیشن مکمل تھی، اور وہ اگر کسی اخبار یا نیوز نیٹ ورک کے ہاتھ لگ جاتی تو افریقہ میں وہ ورلڈ بینک کا سب سے بڑا اسکینڈل ہوتا۔ ان سات لوگوں نے وہ پریزنٹیشن بے تاثر چہروں کے ساتھ اپنی اپنی کرسیوں پر ساکت بیٹھے دم سادھے دیکھی تھی۔ لیکن آدھ گھنٹہ کی اس پریزنٹیشن کے ختم ہونے کے بعد ان ساتوں کے ذہن میں جو خدشہ ابھرا تھا وہ ایک ہی تھا۔۔۔ سالار سکندر کے ہاتھ میں وہ گرینیڈ تھا جس کی پن وہ نکال کر اسے ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔۔۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ گرینیڈ دوسرے کی طرف پھینک دینے سے ان کی جان چھوٹ جاتی۔۔۔ وہ جہاں بھی پھٹتا وہیں تباہی پھیلاتا۔

پروجیکٹر کی اسکرین تاریک ہوئی۔ سالار نے اپنے لیپ ٹاپ کو بند کرتے ہوئے ان ساتوں لوگوں کے چہروں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

پر نظر ڈالی' مائیکل کے چہرے کو دیکھا جو اس کی صدارت کر رہا تھا۔ اتنے سالوں کی پبلک ڈیلنگ کے بعد وہ اتنا اندازہ تو لگا ہی پایا تھا کہ اس نے پریزنٹیشن تیار کرنے اور اسے یہاں پیش کرنے میں اپنا وقت "ضائع" کیا تھا۔

"تو تم اس پروجیکٹ پر کام نہیں کرنا چاہتے؟"

مائیکل نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے اس سے جو سوال کیا تھا' اس نے بورڈ روم میں موجود لوگوں کے حوالے سے سالار کے خدشات کی جیسے تصدیق کی تھی۔

"میں یہ چاہتا ہوں کہ ورلڈ بینک کانگو میں اس پروجیکٹ کو ختم کر دے۔" تمہید اگر مائیکل نے نہیں باندھی تھی تو سالار نے بھی اس پر اپنا وقت ضائع نہیں کیا تھا۔

"تم مضحکہ خیز باتیں کر رہے ہو۔ اتنے سالوں سے شروع کیے جانے والے ایک پروجیکٹ کو ورلڈ بینک' ایک چھوٹے سے عہدے دار کے کہنے پر ختم کر دے کیوں کہ اسے بیٹھے بٹھائے یہ فوبیا ہو گیا ہے کہ بینک کانگو میں بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والے پروجیکٹس کو سپورٹ کر رہا ہے۔"

وہ جولیا پٹرورڈ تھی جس نے بے حد تضحیک آمیز انداز میں' سلگا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ سالار سے کہا تھا۔ وہ اس کمرے میں مائیکل کے بعد سب سے سینیئر تھی۔

"اگر میں فوبیا کا شکار یا یہ میرا دماغی خلل ہے اس حوالے سے تو یہ بیماری اس وقت ان جنگلات میں بسنے والے لاکھوں لوگوں کو لاحق ہو چکی ہے۔" سالار سکندر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

"تم کیا ہو۔۔۔؟ کس حیثیت میں کانگو میں بیٹھے ہو؟ ورلڈ بینک کے ایک ایمپلائی کے طور پر یا ایک ہیومن رائٹس ایکٹوسٹ کے طور پر؟ کانگو کے لوگ یا پگمیز تمہارا سر درد نہیں ہیں۔ تمہاری ترجیح صرف ایک ہونی چاہیے کہ تم مقررہ وقت پر اس پروجیکٹ کو مکمل کرو اور تمام اہداف کے حصول کے ساتھ۔"

اس بار بات کو ترشی سے کاٹنے والا الیگزینڈر رافیل تھا جو ورلڈ بینک کے صدر کے قریب ترین معاونین میں سے ایک تھا۔

"تم نے اپنا کانٹریکٹ پڑھا ہے وہ شرائط و ضوابط پڑھی ہیں جو اس کانٹریکٹ میں ہیں اور جن سے تم نے اتفاق کرتے ہوئے سائن کیے ہیں؟ تم اپنے کانٹریکٹ کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔۔۔ اور بینک تمہیں جاب سے نکالنے کا پورا اختیار رکھتا ہے اس کے بدلے میں۔"

اس کے لہجے کی رکھائی اس کا شناختی نشان تھی وہ اسی رکھائی اور بے مہری کے لیے جانا جاتا تھا۔۔۔ سالار وہاں موجود تمام لوگوں کو ان کی قابلیت کے علاوہ ان کی خصوصیات کے حوالے سے بھی جانتا تھا۔

"میں نے اپنا کانٹریکٹ پڑھا ہے اور صرف ایک بار نہیں کئی بار پڑھا ہے۔ میں نے ورلڈ بینک کا چارٹر بھی پڑھا ہے اور نہ میرے کانٹریکٹ میں نہ ورلڈ بینک کے چارٹر میں کہیں یہ تحریر ہے کہ مجھے کوئی ایسا کام کرنا پڑے گا جو بنیادی انسانی حقوق اور کسی ملک کے قوانین و ضابطوں کی دھجیاں اُڑا کر ہو سکے۔۔۔ اگر ایسی کوئی شق میرے کانٹریکٹ میں شامل تھی اور میں اسے نظر انداز کر بیٹھا ہوں تو آپ مجھے ریفرنس دیں۔۔۔ میں ابھی اپنے کانٹریکٹ میں اسے پڑھ لیتا ہوں۔ ای میل کی صورت میں میرا کانٹریکٹ میرے پاس موجود ہے۔" اس نے لیپ ٹاپ ایک بار پھر آن کیا تھا۔

الیگزینڈر رافیل چند لمحوں کے لیے بول نہیں سکا۔ اس کے ماتھے پر بل تھے اور مسلسل تناؤ میں رہنے کی وجہ سے وہ مستقل جھریوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ صرف اس وقت چہرے سے خوش گوار لگتا جب اس کے چہرے پر بھولے بھٹکے ہوئے مسکراہٹ آتی ورنہ کرختگی اس کے مزاج کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا بھی ایک نمایاں حصہ تھی۔ اپنی کرنجی آنکھوں کو موڑتے ہوئے اس نے سالار سے کہا۔

www.PakSociety.com



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تم اپنے آپ کو ان لوگوں سے زیادہ قابل سمجھتے ہو جنہوں نے یہ پروجیکٹ کئی سال کی تحقیق کے بعد شروع کیا تھا۔ تم سمجھتے ہو جنہوں نے فزی بلٹی بنائی تھی۔ وہ ایڈیٹس تھے؟" وہ اب تضحیک آمیز انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں... وہ ایڈیٹس نہیں تھے اور نہ ہی میں ایڈیٹ ہوں... وہ فیئر نہیں تھے اور میں ہوں' بات صرف اس دیانت کی ہے جو اس پروجیکٹ کی فزی بلٹی رپورٹ تیار کرتے ہوئے نظرانداز کی گئی ہے' ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس پروجیکٹ کی فزیبلٹی رپورٹ تیار کرنے والے اتنے عقل کے اندھے اور نااہل ہوں کہ انہیں وہ سب نظر نہ آیا ہو جو مجھے نظر آرہا ہے اور میرے علاوہ اور لاکھوں مقامی لوگوں کو نظر آرہا ہے۔ ورلڈ بینک کو اس پروجیکٹ کے حوالے سے دوبارہ انویسٹی گیشن کرنی چاہیے ایک انکوائری کمیٹی بنا کر... مجھے یقین ہے کہ اس کمیٹی نے دیانت داری سے کام کیا تو انہیں بھی یہ سب نظر آجائے گا جو مجھے نظر آرہا ہے۔" سالار سکندر نے رافیل کے ہتک آمیز جملوں کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میرے خیال میں بہتر ہے کہ اس ڈیڈلاک کو ختم کرنے کے لیے ایک کام کیا جائے جو واشنگٹن اور گومبے میں تمہارے آفس میں اس پروجیکٹ کے حوالے سے پیدا ہو گیا ہے۔"

اس بار بولنے والا بل جاؤلز تھا۔ وہ واشنگٹن میں ورلڈ بینک کی میڈیا کو آرڈی نیشن کو مانیٹر کرتا تھا اور اس پروجیکٹ کے حوالے سے انٹرنیشنل میڈیا میں آنے والی خبروں کو دبانے میں اس کی قابلیت اور اثر و رسوخ کا بڑا عمل دخل تھا۔ "تم ریزائن کر دو جیسے تم نے پریزنٹیشن اور بینک کے ساتھ ہونے والی آفیشل خط و کتابت میں بھی آفر کیا تھا کہ اس پروجیکٹ کو تم اس طرح نہیں چلا سکتے۔"

وہ بڑے تحمل اور رسانیت سے سالار سکندر کو جیسے صلاح دے رہا تھا۔

"اگر یہ آپشن ورلڈ بینک کو زیادہ مناسب لگتا ہے تو مجھے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مجھے بھی اس مسئلے کا حل صرف میرا استعفیٰ نظر آرہا ہے' لیکن میں اپنے استعفے کی وجوہات میں اس پریزنٹیشن میں دیے جانے والے سارے اعداد و شمار شامل کروں گا اور اپنے تحفظات بھی لکھوں گا اور میں اس استعفے کو پبلک کروں گا۔"

بورڈ روم میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھائی تھی۔ وہ بالآخر اس ایک نکتے پر آگئے تھے جس کے لیے سالار سکندر کو کانگو سے واشنگٹن طلب کیا گیا تھا اور جو ورلڈ بینک کے گلے میں ہڈی بن کر پھنسا ہوا تھا۔ بورڈ روم میں بیٹھے ان سات لوگوں کے پاس صرف دو ٹاسک تھے یا سالار سکندر کو اس پروجیکٹ کو جاری رکھنے کے لیے تیار کیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ وہ... وہ رپورٹ واپس لے لے جو اس نے ورلڈ بینک کو اس حوالے سے ارسال کی تھی یا پھر اس سے خاموشی سے استعفیٰ لیا جائے اور وہ استعفیٰ ذاتی وجوہات کی بنا پر ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ اس کے تحریری استعفے میں بیان نہیں ہونی چاہیے اور اب مسئلہ اس سے بڑھ گیا تھا۔ وہ نہ صرف استعفے میں یہ سب کچھ لکھنا چاہتا تھا بلکہ اس استعفے اور اس رپورٹ کو پبلک بھی کرنا چاہتا تھا۔

اگلے تین گھنٹے تک وہ بورڈ روم میں بیٹھے ہوئے سات افراد اس کے ساتھ بحث کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ انہوں نے اس پر ہر حربہ استعمال کر لیا تھا۔ جب دلیلوں سے کام نہیں بنا تھا تو انہوں نے بینک کے کانٹریکٹ میں استعفے کے حوالے سے کچھ شقوں کو اٹھا کر اسے دھمکی دی تھی کہ وہ جاب کے دوران اپنے علم میں لائے گئے تمام پروفیشنل معاملات کو صیغہ راز میں رکھنے کا پابند ہے اور اس استعفے کو پبلک کرنے اور اس رپورٹ کو میڈیا پر لانے پر اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جا سکتی تھی اور اسے نہ صرف مالی طور پر لمبا چوڑا ہرجانہ بھرنا پڑتا' بلکہ وہ آئندہ بینک یا اس سے منسلک کسی بھی چھوٹے بڑے ادارے کی جاب کرنے کے لیے نااہل قرار دے دیا جاتا۔ سالار سکندر کو پتا تھا' یہ دھمکی نہیں تھی' بہت بڑی دھمکی تھی۔ وہ بالواسطہ طور پر اسے بتا رہے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے کہ وہ اس کے پروفیشنل کیریئر کو کم از کم صرف ورلڈ بینک میں ہی نہیں بلکہ ان تمام انٹرنیشنل آرگنائزیشنز میں ختم کر دیتے جو امریکا کی سرپرستی میں چلتی تھیں اور اسے پتا تھا وہ یہ کر سکتے تھے۔

وہ اب بین الاقوامی طور پر جس سطح پر کام کر رہا تھا وہاں اس کے حوالے سے ایک چھوٹی سی قانونی چارہ جوئی بھی ایک اکنامسٹ فنانشل تجزیہ کار کے طور پر اس کی ساکھ تباہ کر کے رکھ دیتی۔ کوئی نامور ادارہ اس کے خلاف اس طرح کے الزامات پر ہونے والی قانونی چارہ جوئی کے بعد اسے کبھی نہ رکھتا کہ اس نے اپنے کانٹریکٹ میں موجود راز داری کی شق کی خلاف ورزی کی تھی۔ یہ اس کی ساکھ پر لگنے والا ایسا دھبا ہوتا جسے وہ کبھی بھی مٹا نہیں سکتا تھا۔ ان سات لوگوں نے اسے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ ورلڈ بینک اس کے ماتحت کانگو میں چلنے والے پروجیکٹس کو نئے سرے سے آڈٹ کروائے گا اور مالی اور دوسری بے ضابطگیوں کے بہت سے ثبوت نکال کر اسے بہت بے عزت کر کے اس عہدے سے فارغ کیا جا سکتا تھا جس پر وہ کام کر رہا تھا' پھر اگر وہ اس پروجیکٹ کے حوالے سے اپنی رپورٹ لے کر میڈیا کے پاس بھی جاتا تب بھی اس کے الزامات اور رپورٹ اپنی حیثیت کھو دیتے' کیونکہ بینک کے پاس جوابی طور پر اس کے خلاف کہنے کے لیے بہت کچھ ہوتا اور میڈیا اس کی اس رپورٹ کو ذاتی عناد اور بغض کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ نچلے درجے کی بلیک میلنگ تھی جس پر وہ اتر آئے تھے۔ سالار جانتا تھا وہ یہ کر بھی سکتے تھے۔ اس کی فنانشل اور پروفیشنل دیانت داری پر ورلڈ بینک میں کبھی انگلی نہیں اٹھائی گئی تھی اور اس کا پروفیشنل ریکارڈ اس حوالے سے قابل رشک تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا اگر ورلڈ بینک کانگو میں اس کے آفس کے ذریعے چلنے والے پروجیکٹس میں کوئی سقم یا غبن تلاش کرنے پر مصر تھا تو وہ یہ ڈھونڈ ہی لیتے۔ وہ یا دنیا کا کوئی بندہ ورلڈ بینک کی آڈٹ ٹیم کی چھری سے نہیں بچ سکتا تھا اگر انہیں اس مقصد کے ساتھ بھیجا گیا ہو کہ انہیں کسی جگہ پر ہر صورت میں کوئی مالی بے ضابطگی تلاش کرنا ہی تھی۔

عام حالات میں سالار اس طرح کے کسی معاملے پر اپنے آپ کو اتنی مشکل صورت حال میں کبھی نہ ڈالتا' خاص طور پر اب جب اس کی ایک فیملی تھی۔ ایک بیوی تھی۔ کم سن بچے تھے۔ جو اس پر انحصار کرتے تھے لیکن یہ عام حالات نہیں تھے۔ پیٹرس ایباکا نے اسے ان سارے معاملات کے معاملے میں بے حس نہیں رہنے دیا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی۔ وہ افریقہ اور پگمیز کے بارے میں جذباتی ہو کر سوچنے لگا تھا اور اس کی یہ ہی جذباتیت اس وقت اس کے آڑے آ رہی تھی۔ خاموشی سے اس معاملے پر استعفیٰ دے کر اس سارے معاملے سے الگ ہو جانے کا مطلب صرف ایک تھا۔ وہ بھی اس جرم کا شریک کار ہوتا جو اکیسویں صدی کی اس دہائی میں کانگو میں پگمیز کے ساتھ کیا گیا ہوتا۔ وہ روکنے والوں اور احتجاج کرنے والوں میں شامل ہو کر تاریخ کا حصہ نہ بنتا مگر اس کا مسئلہ تاریخ کا حصہ بننے کی خواہش نہیں تھی' صرف ضمیر کی چبھن سے بچنے کی خواہش تھی جو زندگی کے کسی نہ کسی اسٹیج پر اسے احساس جرم کا شکار کرتی۔

دباؤ اور دھمکیاں جتنی بڑھتی گئی تھیں' سالار سکندر کی ضد بھی اتنی ہی بڑھتی گئی تھی۔ اگر سکندر عثمان اس کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ ڈھٹائی میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں تو وہ ٹھیک کہتے تھے۔ اس کا ایک عملی مظاہرہ اس نے واشنگٹن ڈی سی میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں سات لوگوں کے اس گروپ کے سامنے بھی پیش کر دیا تھا جو سالار سکندر جیسے عہدے داران کو چٹکی بجاتے میں موم کی ناک کی طرح موڑ لیتے تھے۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" تین گھنٹے کے بعد بالآخر مائیکل نے اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے جیسے اس سے پوچھا تھا۔

"ایک غیر جانب دارانہ انکوائری ٹیم جو اس پروجیکٹ کا نئے سرے سے جائزہ لے اور اس کے بعد پگمیز اور ان بارانی جنگلات کے بہترین مفاد میں اس پروجیکٹ کو ختم کر دے یا کوئی ایسا حل نکالا جائے جو ان جنگلات میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہنے والے لوگوں کے لیے قابل قبول ہو اور میں مقامی لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔ وہاں کی مقامی حکومت اور اس کے عہدے داران کی بات نہیں کر رہا۔"

سالار سکندر نے جواباً "وہی مطالبہ دہرایا تھا جو اس کی پریزنٹیشن کی بنیاد تھا۔

"تمہاری قیمت کیا ہے؟" الیگزنڈر نے جواباً "جو سوال اس سے کیا تھا اس نے سالار سکندر کو جیسے بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس ہیڈ کوارٹرز میں ہر نرم گرم گفتگو کی توقع کر سکتا تھا لیکن معاملات کو نمٹانے کے لیے اس جملے کی نہیں۔" کوئی تو ایسی چیز ہوگی جس کے لیے تم اپنے اس مطالبے سے ہٹ جاؤ۔ ہمیں بتاؤ وہ کون سی ایسی چیز ہے جس پر تم ہم سے سودا کر لو۔" رافیل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ سالار نے ٹیبل پر رکھی اپنی چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔

Downloaded From Paksociety.com

"میری کوئی قیمت نہیں ہے اور میں نے ورلڈ بینک کو اسی غلط فہمی میں جوائن کیا تھا کہ میں ایسے لوگوں کے ساتھ کام کروں گا جو دنیا میں اپنی پروفیشنل مہارت اور قابلیت سے جانے جاتے ہیں۔ اگر بروکرز کے ساتھ کام کرنا ہوتا، بیچنے، خریدنے اور قیمت لگانے والا تو اسٹاک ایکسچینج میں کرتا یا کسی بینک میں انوسٹمنٹ بینکنگ۔"

وہ نرم لہجے میں ان کے منہ پر جوتا مار گیا تھا اور اس جوتے کی چوٹ ان ساتوں لوگوں نے ایک ہی شدت کے ساتھ محسوس کی تھی۔ وہ سادہ زبان میں انہیں دلال کہہ رہا تھا اور وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سالار سکندر کے ساتھ تو معاملات طے کرنے کے لیے انہیں جن لوگوں نے بھیجا تھا، وہ سالار سکندر کے ساتھ معاملات طے ہونے کے بعد انہیں ان کا کمیشن مختلف شکلوں میں ادا کرتے۔ وہ ورلڈ بینک کے اندر بنی ہوئی لابیز کے نمائندے تھے جو بظاہر مختلف ملکوں اور قوموں کی نمائندگی کرتے تھے، لیکن درحقیقت وہ ان بڑے کارپوریٹ سیکٹرز کے مفادات کا تحفظ کرتے تھے جو اپنی اپنی حکومتوں کے عقب میں کارفرما ہوتے تھے۔

ان ساتوں لوگوں میں سے کسی نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ سُتے ہوئے اور تنے ہوئے چہروں کے ساتھ وہ سب بھی اپنے کاغذات اور لیپ ٹاپ سنبھالنے لگے تھے۔ میٹنگ کسی نتیجے کے بغیر ختم ہو گئی تھی اور سالار کو اندازہ تھا کہ اس میٹنگ میں کی جانے والی باتوں کے بعد ورلڈ بینک میں اس کا کیریئر بھی ختم ہو گیا تھا۔

وہ میٹنگ ہیڈ کوارٹرز میں ہونے والی ہر میٹنگ کی طرح ریکارڈ ہوئی ہوگی۔ سالار کو اس کا اندازہ تھا لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ میٹنگ براہ راست کسی دوسری جگہ پر پیش بھی کی جا رہی تھی۔ سالار سکندر کے اس بورڈ روم سے باہر آنے سے پہلے اس سے نمٹنے کے لیے دوسری حکمت عملی طے ہو گئی تھی۔

الیگزنڈر رافیل بورڈ روم سے سالار کے پیچھے آیا تھا اور اس نے چند منٹوں کے لیے اس سے علیحدگی میں بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ سالار کچھ الجھا لیکن پھر آمادہ ہو گیا تھا۔ وہ کون سی بات تھی جو بورڈ روم میں نہیں کہی جا سکتی تھی اور اب اس ون ٹو ون میٹنگ میں کہی جاتی۔ وہاں وہ باتیں بھی کہہ دی گئی تھیں جو ورلڈ بینک جیسی معتبر آرگنائزیشن کے کسی فرد سے سالار انفرادی طور پر بھی سننے کی توقع نہیں رکھتا تھا چہ جائیکہ یہ کہ وہ اجتماعی طور پر اس سے کہی جائیں۔ وہ صرف مایوس نہیں ہوا تھا اس کی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے ورلڈ بینک کو اس لیے اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے جوائن نہیں کیا تھا۔

الیگزنڈر رافیل کے آفس میں وہ اسی پیرائے کی کوئی مزید گفتگو سننے کی توقع کے ساتھ گیا تھا، مگر اپنے آفس میں الیگزنڈر رافیل کا رویہ اس کے ساتھ حیران کن طور پر مختلف تھا۔

"مجھے یہ ماننے میں کوئی شبہ نہیں کہ میں تمہاری رپورٹ سے بہت متاثر ہوا ہوں اور صرف میں نہیں پریذیڈنٹ بھی۔" اس کے پہلے ہی جملے نے اس کو حیران کر دیا تھا۔ وہ کافی کا کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے اپنا کپ لیے اپنی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

سیٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ پریذیڈنٹ سے مراد رالف ایڈگر تھا جو اس وقت ورلڈ بینک کا پریذیڈنٹ تھا اور رافیل اس کے قریب ترین معاونین میں سے تھا بلکہ کئی اعتبار سے اس کو پریذیڈنٹ کا دست راست سمجھا جاتا تھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے رافیل کا انداز بدل چکا تھا۔ اس کے چہرے کی کرختی ہونٹوں کے اس خم کی وجہ سے کچھ کم ہو چکی تھی جسے صرف ڈکشنری میں مسکراہٹ کہا جاتا تھا لیکن اس کا مقصد وہ نہیں تھا جو مسکراہٹ کا مطلب ہوتا تھا۔ الیگزنڈر رافیل اگر دنیا میں کسی کے ساتھ وفادار اور دوست تھا تو وہ اس کا کتا تھا اور صرف اس کتے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر کبھی سچی مسکراہٹ آئی ہوگی' ورنہ دوست نظر آنے کی کوشش ہر اس بندے پر ناکام رہتی جو الیگزنڈر کو جانتا تھا اور سالار الیگزنڈر رافیل کو نہ صرف جانتا تھا بلکہ اس وقت اس کے اور اس کے کتے کے بارے میں کچھ اس طرح کی باتیں سوچ رہا تھا جنہیں وہ رافیل کے سامنے دہرا نہیں سکتا تھا' لیکن اس کے اس بدلے ہوئے رویے اور انداز نے اسے چوکنا کر دیا تھا۔ کافی کا گھونٹ لیے بغیر اور پلکیں جھپکائے بغیر وہ رافیل کی گفتگو سنتا رہا جو کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے بڑے نرم دوستانہ انداز میں اس سے بات کر رہا تھا۔

"پریذیڈنٹ ہمیشہ سے تم سے بہت زیادہ توقعات رکھتے تھے۔ افریقہ کے لیے جو وژن ان کا ہے اسے جو عملی جامہ پہنا سکتا ہے' وہ صرف تم ہو اور یہ پروجیکٹ تو ان سینکڑوں پروجیکٹس میں سے صرف ایک پروجیکٹ ہے' بہت چھوٹا پروجیکٹ... جو وہ تمہارے لیے سوچتے ہیں' وہ بہت بڑی شے ہے۔ تمہارے ذریعے افریقہ کی تقدیر بدلی جا سکتی ہے اور میں تمہیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ پریذیڈنٹ افریقہ کے بارے میں بہت سنجیدہ ہیں۔ وہ مخلص ہیں اور وہاں سے بھوک' غربت اور بیماری کو واقعی مٹانا چاہتے ہیں۔ پیٹرس ایباکا ایک بے وقوف آدمی ہے' وہ کچھ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے جو افریقہ کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔"

سالار کو گفتگو میں پیٹرس ایباکا کا حوالہ سن کر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ واشنگٹن میں بیٹھے لوگ مکمل طور پر اس بات سے باخبر تھے کہ اس کی ماہیئت قلب کے پیچھے کون تھا۔

"تم نے کوئی سوال نہیں کیا؟" رافیل کو اچانک اس کی خاموشی چبھی۔ اگر وہ سالار کو اس کے بارے میں' پریذیڈنٹ کے تعریفی کلمات پہنچا کر اسے جوش دلانا چاہتا تھا تو وہ ناکام ہو رہا تھا۔ سالار کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"میرے پاس جو بھی سوال تھے وہ میں اپنی رپورٹ میں اٹھا چکا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ پریذیڈنٹ افریقہ میں میرے کام اور اس رپورٹ سے متاثر ہیں لیکن میں زیادہ خوش تب ہوں گا جب اس رپورٹ پر مجھے ورلڈ بینک کا کوئی پازیٹو رسپانس آئے۔"

"بینک تمہیں وائس پریذیڈنٹ کا عہدہ دینا چاہتا ہے اور یہ پریذیڈنٹ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس مہینے کے آخر تک' دو وائس پریذیڈنٹس اپنی Tenure (مدت ملازمت) پوری کر کے اپنے عہدوں سے الگ ہو رہے ہیں اور ان میں سے ایک سیٹ پر تمہیں اپائنٹ کرنا چاہتے ہیں وہ... اور اس سلسلے میں امریکن گورنمنٹ سے بھی بات ہوئی ہے ان کی... وہاں سے بھی رسپانس بہت پوزیٹو ہے... تم یقیناً" ڈیزرو کرتے ہو کہ تمہیں تمہاری صلاحیت اور قابلیت کے حساب سے عہدہ دیا جائے۔"

رافیل اس طرح بات کر رہا تھا جیسے بہت بڑا راز اس پر افشا کر رہا ہو۔ ایسا راز جس کو جاننے کے بعد سالار سکندر کی باچھیں کھل جاتیں... اس کی مایوسی کی انتہا نہیں رہی تھی جب اس نے میز کے دوسری طرف بیٹھے اپنے سے پندرہ سال چھوٹے اس سینتیس سالہ مرد کے چہرے کو اس خبر پر بھی بے تاثر پایا تھا۔

"اور وائس پریذیڈنٹ کے عہدے کے بدلے میں مجھے کیا کرنا ہے؟" رافیل کو اپنی اتنی لمبی تقریر کے جواب میں



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

اتنا ڈائریکٹ اور دوٹوک سوال سننے کی توقع نہیں تھی۔

"پریذیڈنٹ کو اس پروجیکٹ پر تمہاری سپورٹ چاہیے۔ مطلق اور غیر مشروط سپورٹ۔"

رافیل نے اب لفاظی اور تمہیدوں میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ سالار سکندر کے لیے یہ دونوں چیزیں بے کار اور بے اثر تھیں۔

"میرا خیال ہے میں وہ نہیں دے سکوں گا۔ اس پروجیکٹ کے حوالے سے میری جو رائے اور اسٹینڈ ہے وہ میں بتا چکا ہوں۔ مراعات اور عہدے میرے اسٹینڈ کو بدل نہیں سکتے۔ میری خواہش ہے افریقہ کے لیے پریذیڈنٹ اگر اتنی ہمدردی اور اخلاص رکھتے ہیں تو وہ اس رپورٹ سے صرف متاثر نہ ہوں وہ فوری طور پر اس پر کوئی ایکشن لیں۔ کیا کچھ اور ہے جو آپ کو کہنا ہے؟"

سالار نے کافی کے اس کپ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا جو اس کے سامنے پڑا تھا۔ الیگزنڈر رافیل دنیا کی بہت بڑی بڑی آرگنائزیشنز میں ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ سالار سکندر کو وہ اس ملاقات سے پہلے کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اب اسے بے وقوف سمجھتا تھا۔ سینتیس سال کی عمر میں ــــ پلیٹ میں رکھ کر اسے اتنا بڑا عہدہ پیش کیا جا رہا تھا اور وہ اسے ٹھکرا رہا تھا۔۔۔ غرور تھا۔۔۔ تو بے جا تھا۔۔۔ بے وقوفی تھی تو انتہا کی اور تنگ تھی تو بے مقصد۔۔۔ صدارت پیش کی اس نے اپنی پوری زندگی میں کسی "ذہین" آدمی کو اتنا "بے وقوف" اور "بے غرض" نہیں پایا تھا۔ وہ یہ اعتراف نہیں کرنا چاہتا تھا پر کر رہا تھا۔ وہ پہلی بار ذہانت کو بے لوث اور بے غرض دیکھ رہا تھا اور وہ جانتا تھا وہ جس دنیا میں کام کر رہا تھا وہاں اس بے غرض اور بے لوث ذہانت کو عروج کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ وہاں بیٹھے اس نے سالار سکندر سے کہا تھا۔

"تمہیں سب کچھ آتا ہے۔ ٹیکٹ نہیں آتے اس لیے تم کامیابی کے سب سے اوپر والے زینے پر کبھی کھڑے نہیں ہو سکو گے۔" وہ اس سے ایسی بات نہیں کہنا چاہتا تھا پھر بھی کہہ بیٹھا تھا۔

"اگر ٹیکٹ فل ہونے کا مطلب بے ضمیر اور بد دیانت ہونا ہے تو پھر یہ خصوصیت میں کبھی اپنے اندر پیدا نہیں کرنا چاہوں گا۔ میں اپنا استعفیٰ آج ہی میل کر دوں گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آخری مصافحے کے لیے الیگزنڈر رافیل کی طرف ٹیبل پر کچھ جھک کر ہاتھ بڑھایا تھا۔ رافیل اٹھنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے اٹھنا پڑا تھا۔ وہ مصافحہ کر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سالار سکندر کی پشت کو دیکھتا رہا اور کیوں دیکھتا رہا تھا۔ وہ یہ نہیں جان پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

سالار سکندر جب ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹرز سے نکلا اس وقت بوندا باندی ہو رہی تھی وہ کیب پر وہاں آیا تھا اور واپسی پر بھی اس کو کیب میں ہی واپس جانا تھا مگر جو کچھ وہ پچھلے چند گھنٹوں میں اندر بھگت آیا تھا۔ اس کے بعد وہ بے مقصد ہیڈ کوارٹرز سے باہر آ کر پیدل فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ اس کا ہوٹل وہاں سے قریب تھا۔ وہ پیدل چلتا رہتا تو آدھ پون گھنٹے میں وہاں پہنچ جاتا۔ وہاں آتے ہوئے اسے جلدی تھی۔ واپس جاتے ہوئے نہیں۔ بوندا باندی کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی مگر وہ اپنے سوٹ کے اوپر لانگ کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ گومیے سے چلتے ہوئے واشنگٹن کی اگلے تین دن کی موسم کی پیش گوئی پڑھ کر چلا تھا۔ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ امریکا میں گزارنے کی وجہ سے وہ جیسے عادی ہو گیا تھا۔ ایک لگی بندھی اور میکانکی انداز میں زندگی گزارنے کا جہاں ہر چیز پہلے سے دیکھ کر کی جاتی ہے۔ موسم کا حال دیکھ کر سفر پلان کیا جاتا ہے۔ بکنگ کروا کر کسی ہوٹل کے لیے روانہ ہوا جاتا ہے۔ ہر چیز کے بارے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

پہلے سے طے کرلیا جاتا ہے۔ اس نے ورلڈ بینک میں اس جاب کا بھی اسی میکانکی اور پروفیشنل انداز میں ادراک کیا تھا، لیکن جو کچھ وہ اب بھگت رہا تھا وہ کبھی اس کے فرشتوں نے بھی نہیں سوچا ہوگا۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے بعد وہ اس کی پہلی جاب تھی اور وہ اس جاب سے بہت خوش تھا۔ وہ اب زندگی کو پانچ، دس، پندرہ، بیس سالوں کے تناظر میں دیکھتا تھا، کیونکہ اب اسے اپنے ساتھ ساتھ کچھ اور زندگیوں کی ذمہ داریوں کو بھی اٹھانا تھا اور اب یک دم وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے سب سے بڑے بحران میں پھنس گیا تھا۔ اس کے ساتھ بیوی اور بچوں کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں، تب وہ اس طرح پریشان نہ ہوتا کیونکہ جو بھی نتائج ہوتے اس کے کسی بھی فیصلے کے، وہ صرف اسے بھگتنے پڑتے۔ کوئی اور اس کے کسی فیصلے سے پہنچنے والے کسی نقصان میں شریک نہ ہوتا... لیکن اب...

فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ وہ چند دن پہلے تک اپنے آپ کو دنیا کا مصروف ترین انسان سمجھتا تھا اور اب ان چند گھنٹوں کے بعد دنیا کا بے کار ترین انسان...

کچھ عجیب سی ذہنی کیفیت تھی اس وقت اس کی... فی الحال اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی میٹنگ... کوئی وزٹ... کوئی ایجنڈا نہیں... کوئی فون کال کوئی ای میل کوئی پریزنٹیشن بھی نہیں... لیکن سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ ایک لمحے کے لیے چلتے چلتے اسے خیال آیا... کیا ہو اگر وہ سمجھوتا کرلے... وہیں سے واپس ہیڈ کوارٹرز چلا جائے... وہ پیش کش قبول کرلے جو ابھی اسے کی گئی تھی۔ کوئی مشکل اور ناممکن تو نہیں تھا یہ... ابھی سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہوجاتا... زندگی پھر پہلے جیسی ہوجاتی۔ ورلڈ بینک میں پہلے سے بھی زیادہ بڑا عہدہ... ترقی... مراعات... اسٹیٹس... کیا برائی تھی اگر وہ ضمیر کو کچھ دیر کے لیے سلا دیتا... کانگو اس کا ملک نہیں تھا، نہ پگمیز اس کے لوگ... پھر؟

پھر... واقعی ٹھیک کہا تھا رافیل نے، وہ کیوں ان کے لیے یہ سب کررہا تھا اور یہ سب کرتے کرتے اپنے آپ کو وہاں لے آیا تھا۔ جہاں آگے کنواں تھا پیچھے کھائی... لیکن پھر اسے وہ ساری غربت اور بدحالی یاد آئی تھی جو اس نے ان لوگوں سے ملاقاتوں میں دیکھی تھی... وہ امید بھری نظریں یاد آئی تھیں... جن سے وہ اسے دیکھتے تھے... کاغذات کا وہ پلندہ یاد آیا تھا جس کا ایک ایک لفظ کہتا تھا کہ وہاں جو بھی ہورہا تھا، وہ انسانیت کی تذلیل تھی۔ وہ غلامی اور غلامانہ استحصال تھا، جو اس کا مذہب چودہ سو سال پہلے ختم کرچکا تھا۔

اور یہ سب یاد کرتے ہوئے اسے امامہ بھی یاد آئی تھی۔

اس نے جیب سے سیل فون نکال کر فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اسے کال کی، رابطہ نہیں ہوا۔ اسے لگا شاید سگنلز کا کوئی مسئلہ ہوگا۔ فون اس نے دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ ایک عجیب سی اداسی اور تنہائی نے اسے گھیرا تھا حالانکہ وہاں فٹ پاتھ پر اس کے آس پاس سے درجنوں لوگ گزر رہے تھے اور برابر میں سڑک پر کئی گاڑیاں چل رہی تھیں... پھر بھی اس نے عجیب سی تنہائی محسوس کی تھی... یہ ویسی ہی تنہائی تھی جو وہ امامہ کی عدم موجودگی میں محسوس کرتا تھا۔

امامہ سے شادی ہونے تک وہ ڈپریشن کے کئی ادوار میں سے گزرا تھا... لیکن ہر بار وہ اس دور سے نکل آتا تھا... وسیم کی موت کے بعد امامہ کی ذہنی حالت نے اسے ایک بار پھر بری طرح انتشار کا شکار کیا تھا، مگر یہ ڈپریشن پہلے جیسا نہیں تھا۔ اس نے کبھی بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اسے لگتا تھا، سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا اور سب کچھ واقعی ٹھیک ہوگیا تھا اور اب کئی سالوں سے سب کچھ ٹھیک تھا، اب ایک بار پھر سے زندگی عجیب بدو جزر میں آپھنسی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

"مجھے لگتا ہے' میری زندگی میں سکون نہیں ہے۔ کچھ دیر کے لیے سب کچھ ٹھیک رہتا ہے' پھر کچھ نہ کچھ غلط ہونے لگتا ہے۔"

اس نے کئی بار امامہ سے یہ سنا تھا اور وہ کبھی اس سے یہ اعتراض نہیں کر سکا تھا کہ یہ صرف اس کی نہیں' خود اس کی اپنی زندگی کا بھی یہی انداز تھا۔۔۔ کہیں نہ کہیں کچھ ٹھیک نہیں رہتا تھا' اس کی زندگی میں بھی۔۔۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن امامہ کے مل جانے کے بعد بھی۔۔۔ وہ ویسی زندگی نہیں جی رہا تھا جیسی زندگی وہ امامہ کے ساتھ گزارنے کا خواہش مند تھا یا تصور کرتا تھا۔۔۔ لیکن یہ صرف امامہ کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی ہی نہیں تھی جو نشیب و فراز سے گزرتی رہی تھی۔ اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں بھی عجیب و غریب حالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔

اس فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ایک لمبے عرصے کے بعد سالار سکندر نے اپنی سینتیس سالہ زندگی کے حاصل' محصول پر نظر دوڑائی تھی۔۔۔ نعمتیں یقیناً" بے شمار تھیں۔۔۔ اتنی کہ وہ گننے بیٹھتا تو گنتی بھول جاتا۔۔۔ لیکن بے سکونی تھی جو کسی بلا کی طرح ان کی زندگیوں کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔ وہ بے سکونی کی جڑ تک پہنچنے میں ناکام رہتا تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ عملی مسلمان تھا۔ عبادات اور حقوق العباد دونوں میں مثالی۔۔۔ گناہوں سے تائب۔۔۔ نعمتوں سے سرفراز۔۔۔ لیکن سکون دل کو ترستا ہوا۔۔۔ خالی پن کا شکار۔۔۔

سوچوں کی رفتار ایک دم ٹوٹی تھی۔۔۔ وہ حیران ہوا تھا۔۔۔ وہ کس بحران میں کیا سوچنے بیٹھ گیا تھا۔ وہ آزمائش میں پھنسا تھا لیکن وہ اتنی بڑی آزمائش نہیں تھی کہ وہ اپنی پوری زندگی کے حاصل و محصول کو اس بوندا باندی میں' ورلڈ بینک کی عمارت سے اپنے ہوٹل تک کے راستے میں چلتے ہوئے سوچتا۔۔۔ اس کی چھٹی حس اسے جیسے بڑے عجیب انداز میں بے چین کر رہی تھی۔

Downloaded From Paksociety.com

اس نے اپنی ہر منفی سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ شاید یہ ذہنی دباؤ کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ اس نے چند لمحوں کے لیے سوچا تھا اور پھر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر اپنا لیپ ٹاپ والا بیگ رکھتے ہوئے اس نے معمول کے انداز میں ٹی وی آن کیا تھا۔ ایک مقامی چینل پر واشنگٹن میں صبح سویرے ہونے والے ایک ٹریفک حادثے کی خبر چل رہی تھی' جس میں دو مسافر موقع پر مر گئے تھے' جبکہ تیسرا مسافر شدید زخمی حالت میں اسپتال میں تھا۔ لوکل چینل پر تباہ شدہ گاڑی کو جائے وقوع سے ہٹایا جا رہا تھا۔ اپنا لانگ کوٹ اتارتے ہوئے سالار نے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے چینل بدلنا چاہا' لیکن پھر اسکرین پر چلنے والے ایک ٹکر کو دیکھتے ہوئے وہ جامد ہو گیا۔ اسکرین پر اسکرول میں اس حادثے کے متعلق مزید تفصیلات دی جا رہی تھیں اور اس میں زخمی ہونے والے شخص کا نام پیٹرس ایباکا بتایا جا رہا تھا جو ایک activist (انقلابی) تھا اور سی این این کے کسی پروگرام میں شرکت کے لیے آ رہا تھا۔ سالار کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔

دنیا میں ہزاروں پیٹرس ایباکا ہو سکتے تھے۔۔۔ لیکن کانگو میں پگمیز کے لیے کام کرنے والا پیٹرس ایباکا ایک ہی تھا۔ اور سالار یہ بھی جانتا تھا کہ وہ پچھلے کئی دنوں سے امریکا میں تھا۔ وہ امریکا روانہ ہونے سے پہلے اس سے ملنے آیا تھا' اور اس نے سالار کو بتایا تھا کہ اس کے کچھ دوستوں نے بالآخر بڑی کوششوں اور جدوجہد کے بعد کچھ بڑے نیوز چینلز کے نیوز پروگرامز میں اس کی شرکت کے انتظامات کیے تھے اور یہ گارڈین میں شائع ہونے والی رپورٹ کے بعد ممکن ہو سکا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ چھری میری گردن پر گرنے والی ہے۔" سالار نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔ "تم اگر اس پروجیکٹ کے حوالے سے ورلڈ بینک اور اس کے عہدے داران پر تنقید کرو گے تو سب سے پہلے میں ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

نظروں میں آؤں گا اور یہ چینلز مجھ سے ریٹنگس لینے کے لیے رابطہ کریں گے۔"

سالار کو اس مشکل صورت حال کا اندازہ ہونے لگا تھا جس میں وہ پیٹرس ایباکا کے انٹرویوز کے بعد پھنستا۔ وہ آتش فشاں جو بہت عرصے سے پک رہا تھا' وہ اب پھٹنے والا تھا اور پھٹنے کے ساتھ ساتھ وہ بہت سوں کو بھی ڈبونے والا تھا۔

"میں تمہیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔" ایباکا نے اسے یقین دلایا تھا۔ "میں تم پر کوئی تنقید نہیں کروں گا بلکہ تمہاری سپورٹ کے لیے تمہاری تعریف کروں گا۔ تم تو اب آئے ہو یہ پروجیکٹ تو تمہارے آنے سے پہلے سے جاری ہے۔"

ایباکا بے حد سنجیدہ تھا لیکن سالار کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کی یہ یقین دہانی ایک خوش فہمی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ سالار سکندر اس پروجیکٹ کی سربراہی کر رہا تھا اور نہ اسے جمعہ جمعہ چار دن ہوئے تھے وہاں آئے۔۔۔ نہ تو یہ وہ اتنا احمق ہو سکتا تھا کہ کسی پروجیکٹ کی تفصیلات جانے بغیر اسے جوائن کر لیتا۔ اگر وہ اس کا حصہ تھا تو کسی نہ کسی حد تک اسے بھی میڈیا کی شدید تنقید کا سامنا ہونے والا تھا۔ ایباکا کی تعریف ورلڈ بینک کی انتظامیہ کی نظروں میں اس کا امیج خراب کرتی اور اس کی خاموشی دنیا کی نظروں میں۔۔۔

"تم جلد سے جلد ورلڈ بینک چھوڑ دو۔ میں تمہاری رپورٹ کا حوالہ دوں گا کہ اس پروجیکٹ سے ناخوش تھے اور تمہارے اس پوزیشن کو چھوڑنے کی وجہ بھی یہ ہی ہے۔" ایباکا نے جیسے اسے ایک راہ دکھائی تھی۔

"میں اس سے پہلے ایک کوشش ضرور کروں گا کہ بینک کو مجبور کر سکوں کہ وہ اس پروجیکٹ پر نظر ثانی کرے۔"

جو راستہ وہ سالار کے لیے نکال رہا تھا وہ سالار کو بھی پتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔ بینک کا رد عمل جاننے کے لیے۔۔۔ اسے جیسے یہ امید تھی کہ بینک اگر فوری طور پر اس پروجیکٹ کو نہیں روکتا تب بھی کوئی انکوائری تو آرڈر کر ہی سکتا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اتنے تفصیلی ثبوتوں کے باوجود بینک آنکھیں بند کر کے صم" و بکم" کی طرح بیٹھا رہتا۔

ایباکا نے اس کے ساتھ کوئی بحث نہیں کی تھی۔ وہ ان دونوں کا آخری رابطہ تھا۔ وہ واشنگٹن آنے تک میڈیا پر ایباکا اور کانگو کے بارانی جنگلات کے حوالے سے کوئی نئی خبر تلاش کرتا رہا' لیکن وہ نئی خبر اسے آج ملی تھی۔ نیوز چینل بتا رہا تھا کہ بچنے والے مسافر کی حالت تشویش ناک تھی۔ سالار کچھ دیر شل ہوتے ہوئے اعصاب کے ساتھ کھڑا رہا پھر اس نے اپنا فون نکال کر یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ ایباکا کو کہاں لے جایا گیا تھا۔ عجیب اتفاق تھا' لیکن یک دم جیسے اس کا فون رابطوں کے مسائل کا شکار ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ کانگو میں امامہ سے رابطہ نہیں کر پایا تھا اور اب وہ کوئی لوکل کال نہیں کر پا رہا تھا' کچھ دیر اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف رہنے کے بعد ناکامی پر سالار نے جیسے جھنجلا کر کمرے میں موجود فون لائن اٹھا کر اسے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ فون لائن بھی کام نہیں کر رہی تھی۔ سالار حیران ہوا تھا۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا اور اس کی فون لائن کا ڈائریکٹ کام نہ کرنا حیران کن ہی تھا۔ اس نے انٹرکام پر آپریٹر کے ذریعے ایک کال بک کروائی تھی۔

اگلا آدھا گھنٹہ وہ آپریٹر کی کال کا انتظار کرتا رہا۔ وہ پہلا موقع تھا جب سالار کو ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہوئی تھی' پہلی بار اسے لگا تھا جیسے اس کو کسی سے بھی رابطہ کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ وہ اس شک کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر وہ اسی بے چینی اور بے قراری کے عالم میں اپنے کمرے سے نکل کر نیچے استقبالیہ پر آ گیا تھا۔ اس بار کہیں بھی خود کال کرنے کے بجائے اس نے ریسپشنسٹ سے کہا تھا کہ وہ اسے پولیس انکوائری سے پتا کر کے بتائے کہ آج صبح واشنگٹن میں ہونے والے اس ٹریفک حادثے کے زخمی کو کہاں لے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

جایا گیا تھا۔ ریسپشنسٹ نے اسے لابی میں پڑے ایک صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور چند ہی منٹوں میں اس نے سالار کو اس اسپتال کا نام بتا دیا تھا جہاں پیٹرس ایباکا کو لے جایا گیا تھا۔ سالار نے اسی ریسپشنسٹ کو کانگو میں اپنے گھر کے اور امامہ کا سیل فون نمبر دیا تھا۔ وہ اگلی کال وہاں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جیسے اپنے خدشات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر تک کوشش کرتے رہنے کے بعد ریسپشنسٹ نے اسے کہا تھا کہ اس کے گھر کے نمبر زیا امامہ کے سیل فون، کسی پر کال نہیں ہو پا رہی تھی شاید کانگو اور امریکا کے درمیان اس وقت رابطوں میں گڑبڑ تھی۔ سالار کے خدشات کی لمحہ بھر میں ہوا نکل گئی تھی۔ وہ شاید ضرورت سے زیادہ وہم کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے سوچا اور ریسپشنسٹ سے اپنے کمرے کی ڈائریکٹ فون لائن کے فنکشنل نہ ہونے کی شکایت کرنے کے بعد وہ وہیں سے اسپتال کے لیے روانہ ہو گیا تھا جہاں پیٹرس داخل تھا۔

اسپتال پہنچ کر پیٹرس کو تلاش کرنا مشکل نہیں تھا، لیکن اسے ایباکا سے ملنے نہیں دیا گیا تھا۔ وہ مخدوش حالت میں تھا اور اس کی سرجری کے بعد اسے مصنوعی تنفس پر رکھا گیا تھا۔ اپنے آپ کو ایباکا کا رشتہ دار ظاہر کرنے پر اسے بہرحال ایباکا کو دور سے ایک نظر دیکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ مگر استقبالیہ پر موجود شخص نے اسے بے یقینی اور شبہ کی نظر سے دیکھا تھا۔ ایک پگمی اور ایک جنوبی ایشیا میں رہنے والے کی رشتہ داری کیسے ممکن تھی...؟ لیکن اب اگر کوئی اس کا دعوے دار ہو گیا تھا تو وہ کیا کر سکتا تھا۔ ایباکا کی حالت ویسے بھی اتنی نازک تھی کہ وہ کسی بھی وقت مر سکتا تھا۔ اس کا دماغ آہستہ آہستہ کام کرنا چھوڑ رہا تھا اور ریسپشن پر موجود آدمی نے جیسے ایک مرتے ہوئے شخص کے لیے احساس ہمدردی دکھایا تھا۔

اسپتال کے آئی سی یو میں نلیوں، تاروں اور پٹیوں میں جکڑے ایباکا کو سالار پہلی نظر میں پہچان نہیں سکا تھا۔ وہ سیاہ فام پست قامت آدمی موٹی چمک دار آنکھوں اور ایسی مسکراہٹ کے لیے پہچانا جاتا تھا جو کسی چھوٹی سی بات پر بھی اس کے چہرے پر آجاتی۔ وہ بات بے بات قہقہے لگانے کا بھی عادی تھا اس کے موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں سے نظر آنے والے دودھیا دانت اور مسوڑھے اس کے ہر قہقہے میں سب سے پہلے نمایاں ہوتے تھے۔

آئی سی یو کی کھڑکی سے اسے دیکھتے ہوئے سالار کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کرے۔ اس کا اور ایباکا کا انسانیت کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں تھا، پھر بھی وہ عجیب غم زدہ حالت میں وہاں کھڑا تھا۔ ایباکا کی مخدوش حالت اس کے علم میں آچکی تھی۔ پگمیز اگر ایباکا کو کھو دیتے تو گونگے ہو جانے والے تھے، کوئی چیز ان کے مقاصد کو اس سے زیادہ نقصان نہ پہنچاتی جتنا ایباکا کی موت پہنچانے والی تھی۔ سالار گم صم کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ صرف پگمیز کا نہیں کانگو کا صدر بننا چاہتا تھا۔ ہاورڈ بزنس اسکول اور جان ایف کینیڈی اسکول آف گورنمنٹ سے فارغ التحصیل ہونے والے ممتاز ترین افراد میں سے ایک پیٹرس ایباکا بھی ہوتا، اگر زندگی اسے ایک موقع دیتی... شاید وہ کبھی نہ کبھی کانگو کا صدر بن جاتا اور افریقہ کے نمایاں ترین لیڈرز میں اس کا شمار ہوتا... لیکن زندگی فی الحال اسے یہ موقع نہیں دے رہی تھی۔

وہاں کھڑے کھڑے سالار کو ایک بار پھر جیسے خیال آیا تھا کہ وہ چاہتا تو اب بھی یہ سب ٹھیک کر سکتا تھا۔ ایباکا مر رہا تھا اور اس کے مرنے کے ساتھ ہی وہ سارے حقائق اور شواہد بھی غائب ہو جانے والے تھے۔ پگمیز کو فوری طور پر ایباکا کا متبادل نہیں مل سکتا تھا، جو امریکا میں کسی نہ کسی حد تک رسوخ رکھتا ہو۔ ایباکا کے ساتھ جو دوسرے لیڈرز تھے وہ سب مقامی تھے۔ زیادہ تر ان پڑھ... انہیں صرف جنگل میں لڑنا آتا تھا یا اپنی بقا کے لیے شکار کرنا... کانگو سے باہر کی دنیا میں اپنا کیس پیش کرنے کے لیے ان کے پاس باقی چیزیں اور زبان تو ایک طرف اعتماد تک نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا جس کے ساتھ وہ کسی کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اپنے حق کی بات اس دبنگ انداز میں کہہ سکیں، جس طرح ایباکا کہتا تھا۔ شاید یہ ایک موقع اسے قدرت دے رہی تھی۔ وہ الجھا، بھٹکا Temnpt ہوا۔ ضمیر کا چابک ایک بار پھر اس پر برسا تھا اور ضمیر کا چابک واحد چیز نہیں تھی جس نے سالار کو جھٹکا دیا تھا۔ اس کی اپنے ہوٹل واپسی پر ایک اور بڑا سانحہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے کمرے میں اس کا لاکر کھلا ہوا تھا اور اس لاکر میں موجود اس کا پاسپورٹ اور کچھ دوسرے اہم ڈاکومنٹس غائب تھے، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کا وہ بیگ بھی غائب تھا جس میں اس کا لیپ ٹاپ اور اس رپورٹ سے متعلقہ تمام ثبوتوں کی کاپیاں تھیں۔ سالار کو چند لمحوں کے لیے یقین نہیں آیا، اسے لگا وہ اس کا کمرہ نہیں ہوگا۔ وہ شاید غلطی سے کسی اور کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ حماقت کی انتہا تھی۔ لیکن اس نے جیسے اپنے کمرے سے نکل کر دروازے پر نمبر پڑھا تھا۔ وہ اسی کا کمرہ تھا۔ جو اس باختگی کے عالم میں وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے پاگلوں کی طرح کمرے کے ایک ایک کونے کھدرے کو چھان مارا، صرف اس موہوم امید میں کہ شاید وہ جس ذہنی کیفیت سے گزر رہا تھا، اس میں اس نے خود ہی ان سب چیزوں کو کہیں اور رکھ دیا تھا۔ کمرے میں کہیں کچھ نہیں تھا۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا اور اگرچہ ہوٹل کے کمرے میں رکھی جانے والی کسی بھی قسم کی قیمتی اشیا کے لیے لاکر فراہم کرنے کے ساتھ ہی وہ ہر طرح کی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود سالار کو یقین نہیں آیا کہ وہ سب ہو چکا تھا۔ کوئی اس کے کمرے سے اس کے ٹریول ڈاکومنٹس اور لیپ ٹاپ کیوں لے کر جاتا اور اس سے بھی بڑا سوال تھا کہ کون لے کر گیا تھا۔

بے حد طیش کے عالم میں اس نے فون اٹھا کر فوری طور پر اپنے ساتھ ہونے والے واقعے کی اطلاع مینیجر کو دیتے ہوئے اسے کمرے میں طلب کیا تھا۔ اسے اس وقت بھی یقین تھا کہ کوریڈور میں لگے سی سی ٹی وی فوٹیج کی مدد سے بڑے آرام سے اس کی عدم موجودگی میں اس کے کمرے میں داخل ہونے والے کسی بھی شخص کا پتا چل جائے گا، لیکن مینیجر اور سیکورٹی گارڈز کے اس کے کمرے میں آتے ہی سالار کا دماغ یہ جان کر بھک سے اڑ گیا تھا کہ اس پورے فلور پر صفائی سے متعلقہ کام کرنے کے لیے پچھلے دو گھنٹے اس فلور کے سی سی ٹی وی کیمرے آف کیے گئے تھے۔ یہ ناقابل یقین بات تھی۔ اسے لگا تھا، یک دم جیسے اس کے ہاتھ پاؤں کٹ گئے تھے۔ اس کے پاس جو بھی تھا وہ اس لیپ ٹاپ اور اس کے بیگ میں تھا۔ ان کے غائب ہونے کا مطلب تھا کہ وہ بالکل بے دست و پا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی رپورٹ کے کسی الزام اور تحقیق کو ڈاکومنٹری ثبوت کے بغیر ثابت نہیں کر سکتا تھا اور ان دستاویزاتی ثبوتوں کی ایک کاپی اس کے پاس تھی اور ایک کاپی گومبے میں اس کے گھر کے اس لاکر میں جو وہ امامہ کی تحویل میں دے کر آیا تھا۔

وہ پہلا موقع تھا جب سالار نے ایک عجیب سا خوف محسوس کیا تھا۔ ہر چیز کو اتفاق سمجھتے ہوئے وہ پہلی بار ان سب واقعات کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بڑے آرام سے جڑتے جا رہے تھے۔ وہ وہمی نہیں تھا، نہ ہی سازشی نظریوں پر یقین رکھتا تھا، لیکن جو کچھ اس ایک دن میں ہوا تھا، وہ اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔

پیٹرس ایباکا کا ایک حادثہ میں زخمی ہونا بھی اب اسے ایک اتفاق نہیں لگ رہا تھا۔ کوئی تھا جو پیٹرس ایباکا کو نقصان پہنچانے کے بعد اب اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے بے بس کر رہا تھا۔ پہلا خیال جو اسے وہاں کھڑے کھڑے آیا تھا۔ وہ امامہ اور اپنے بچوں کے تحفظ کا تھا۔ ضروری تھا کہ وہ ان سے رابطہ کرتا اور ہر قیمت پر کرتا۔ اسے یقین تھا، اس ہوٹل کے اندر وہ کبھی بھی کانگو میں امامہ سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا، لیکن اسے امامہ کو متنبہ کرنا تھا، اس سے کہنا تھا کہ وہ ان ڈاکومنٹس کے ساتھ پاکستان ایمبیسی یا کسی پولیس اسٹیشن چلی جائے، کم از کم تب تک جب تک وہ خود وہاں نہیں پہنچ جاتا۔

www.Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے مینجر سے کہا تھا کہ وہ پولیس میں رپورٹ کروانا چاہتا تھا۔ اس کی قیمتی چیزوں کی حفاظت یقیناً" ہوٹل کی ذمہ داری نہیں تھی، لیکن ہوٹل کم از کم اتنی ذمہ داری ضرور دکھاتا کہ اس کی عدم موجودگی میں اس فلور کے سی سی ٹی وی سسٹم کو صفائی کے لیے آف نہ کیا جاتا۔

مینجر نے معذرت کرتے ہوئے فوری طور پر اسے اس کے نقصان کی تلافی کی آفر کی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ پولیس کو اس معاملے میں انوالو نہ کرے، لیکن سالار اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے سے ہی باہر نہیں نکلا تھا، وہ اس ہوٹل سے بھی باہر نکل آیا تھا۔

ایک فون بوتھ سے اس نے ایک بار پھر کانگو میں اپنے گھر کے نمبرز اور امامہ کا نمبر ملانے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ وہی آیا تھا، اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے فون پر ای میلز سوشل میسیجنگ کے ذریعے بھی امامہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کسی ای میل، کسی میسیج کا جواب نہیں آیا تھا۔ سالار نے باری باری پاگلوں کی طرح اپنے آفس کے ہر شخص کو کال کرنی شروع کر دی تھی جو اس کے اسٹاف میں شامل تھا اور جن کے نمبرز اس وقت اس کے پاس تھے۔ کوئی ایک نمبر ایسا نہیں تھا جس پر رابطہ ہو پاتا۔

اس نے بالآخر پاکستان میں سکندر عثمان کو فون کیا تھا اور جب اسے فون پر ان کی آواز سنائی دی تو کچھ دیر کے لیے تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ وہ بالآخر کسی سے بات کرنے میں کامیاب ہو پا رہا تھا۔ سکندر عثمان کو بھی اس کی آواز سے پتا چل گیا تھا کہ وہ پریشان تھا۔

سالار نے کوئی تفصیلات بتائے بغیر مختصراً" انہیں بتایا کہ "وہ اپنی سفری دستاویزات گنوا بیٹھا ہے اور اس وجہ سے وہ فوری طور پر اگلی فلائٹ پکڑ کر واپس نہیں جا سکتا تھا اور وہ امامہ سے رابطہ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے سکندر سے کہا کہ وہ پاکستان سے امامہ کو کال کریں اور اگر اس سے رابطہ نہ ہو سکے تو پھر فارن آفس میں اپنے جاننے والوں کے ذریعے کنشاسا میں پاکستان ایمبیسی کے ذریعے اسے تلاش کریں اور فوری طور پر اس سے کہیں کہ وہ لاکر میں پڑے سارے ڈاکومنٹس سمیت ایمبیسی چلی جائے۔" سکندر عثمان بری طرح کھٹکے تھے۔

"ایسا کیا ہوا ہے کہ تمہیں یہ سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے؟ سالار سب کچھ ٹھیک ہے نا؟"

"پاپا! اس وقت آپ صرف وہ کریں جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں ڈیٹیلز آپ کو بعد میں بتا دوں گا۔" وہ جھنجلا گیا تھا۔

"میں تھوڑی دیر تک آپ کو خود کال کر کے پوچھتا ہوں، آپ میرے فون پر کال مت کریں، نہ ہی میرے نمبر پر میرے لیے کوئی میسیج چھوڑیں۔" اس نے باپ کو مزید تاکید کی۔

"سالار! تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔" سکندر عثمان کا ان ہدایات کے بعد خوف زدہ ہونا لازمی تھا۔

سالار نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ باپ کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کے اپنے حواس ان سے زیادہ خراب ہو رہے تھے۔ فون بوتھ سے کچھ فاصلے پر پڑی ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے بے اختیار خود کو ملامت کی تھی۔ اسے اپنی فیملی کو کانگو میں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا اور ان حالات میں... میٹنگ جاتی بھاڑ میں... وہ اسے آگے پیچھے کروا دیتا... کیا ضرورت تھی اتنی مستعدی دکھانے کی...

اب رات ہو رہی تھی اور صبح سے لے کر اس وقت تک اس کے فون پر کوئی کال، کوئی ٹیکسٹ میسیج نہیں آیا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا تب تک جب تک اس کے فون کو مانیٹر نہ کیا جا رہا ہو یا اس کے سگنلز کو کنٹرول نہ کیا جا رہا ہوتا۔ فون سگنلز کو بہترین حالت میں دکھا رہا تھا مگر سالار کو یقین تھا اس کا فون اور فون کے ذریعے ہوئے اس کے رابطوں کو کنٹرول کیا جا رہا تھا اور کس لیے...؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ اگر اسے نقصان پہنچانا چاہتے تھے تو ان سب ہتھکنڈوں کے بغیر نقصان پہنچاتے' جیسے پیٹرس پر وار کیا گیا تھا اور انہیں اگر اسے بینک سے نکالنا تھا تو وہ یہ کام تو خود ہی کر رہا تھا' پھر یہ سب کیوں کیا جا رہا تھا۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں جیسے کوئی سنسناہٹ ہوئی تھی۔ اسے اچانک احساس ہوا وہ لوگ اسے یہ احساس ہی دلانا چاہتے تھے کہ اسے مانیٹر کیا جا رہا تھا۔ اسے نقصان پہنچایا جا سکتا تھا۔۔۔ اور کس کس قسم کا۔۔۔ اسے یہ بھی بتایا جا رہا تھا اور یہ سب ورلڈ بینک نہیں کر سکتا تھا صرف ورلڈ بینک نہیں۔۔۔ اسے سی آئی اے چیک کر رہی تھی۔ پتا نہیں جو پسینے چھوٹے تھے' وہ جسم کے ٹھنڈا ہونے پر چھوٹے تھے یا گرم ہونے پر۔۔۔ لیکن سالار کچھ دیر کے لیے پانی میں نہا گیا تھا۔ اس کا دماغ اس وقت بالکل خالی ہو گیا تھا۔ یہ کبھی اس کے فرشتوں نے بھی نہیں سوچا ہو گا کہ وہ کبھی کسی ایسے معاملے میں انوالو ہو سکتا تھا کہ سی آئی اے اس کے پیچھے پڑ جاتی اور اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پروجیکٹ ورلڈ بینک کی خواہش نہیں امریکا کی خواہش تھا اور وہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔

وہ ڈیڑھ گھنٹہ وہیں بت کی طرح بیٹھا رہا تھا۔ اسے تین دن کے لیے واشنگٹن میں رہنا تھا اور تیسرے دن واپس چلا جانا تھا' لیکن اب اپنی ٹریول ڈاکومنٹس گم ہو جانے کے بعد اسے یقین تھا' وہ فوری طور پر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ کم از کم تب تک جب تک وہ ان مطالبات پر کچھ لچک نہ دکھاتا جو وہ لوگ اس سے کر رہے تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد سکندر عثمان کو اس نے دوبارہ فون کیا تھا اور انہوں نے اسے بتایا کہ امامہ اور اس کے بچے گھر پر نہیں ہیں۔ گھر لاکڈ ہے اور وہاں کوئی ملازم یا گارڈ نہیں ہے۔ جو ان کے بارے میں کوئی اطلاع دیتا۔ ایمبیسی کے افسران نے کانگو کی وزارت داخلہ کے ساتھ اس سلسلے میں رابطہ کیا تھا' مگر اس کی فیملی کے بارے میں جو بھی پتا چلتا' وہ فوراً" پتا نہیں چل سکتا تھا۔ کچھ وقت تو لگتا ہے۔

جو کچھ وہ فون پر سن رہا تھا' اس کے جسم میں کپکپاہٹ دوڑانے کے لیے کافی تھا۔ امامہ اور اس کے بچے کہیں نہ جا سکتے تھے۔ اس سے پوچھے اور اسے اطلاع دیے بغیر۔۔۔ گارڈز بینک کے فراہم کیے ہوئے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ گھر لاکڈ ہونے پر وہ بھی وہاں سے چلے گئے۔

"میں کوشش کر رہا ہوں فوری طور پر ایمبیسی میرے ویزے کا انتظام کرے اور میں وہاں جا کر خود اس سارے معاملے کو دیکھوں۔"

سکندر عثمان اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

"تم بھی کوشش کرو کہ فوری طور پر وہاں پہنچو۔ امریکن ایمبیسی کو ان کی گمشدگی کی اطلاع دو۔۔۔ تم تو امریکن نیشنل ہو۔۔۔ تمہارے بچے بھی۔۔۔ وہ ہماری ایمبیسی سے زیادہ مستعدی سے انہیں تلاش کر لیں گے۔"

سکندر عثمان نے اسے ایک راستہ دکھایا تھا اور بالکل ٹھیک دکھایا تھا' لیکن وہ باپ کو اس وقت یہ نہیں کہہ پایا تھا کہ وہ اس وقت امریکن گورنمنٹ کے ساتھ ہی الجھ پڑا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا سالار! تم پریشان مت ہو۔ کانگو میں ابھی اتنا بھی اندھیر نہیں مچا کہ تمہاری فیملی اس طرح غائب ہو جائے۔"

سکندر عثمان اگر کانگو میں رہ چکے ہوتے تو شاید کبھی یہ جملہ نہ کہتے۔ وہ شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا بیٹا جو امریکن نیشنل اور ورلڈ بینک سے منسلک تھا اس کے یا اس کی فیملی کے ساتھ کچھ بھی غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ جواب میں کہنے کے لیے سالار کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔ کچھ بھی۔۔۔

آج وہ محاورتاً" نہیں حقیقتاً" گونگا ہوا تھا اور جب کچھ بول نہیں پا رہا تھا تو اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر بے ہنگم انداز میں چلائے۔۔۔ سکندر عثمان سے مزید کچھ بھی کہے بغیر وہ فون رکھ کر فون بوتھ سے آ گیا تھا۔ اس فون

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

بوتھ سے واپس ہوٹل میں جانے میں اسے صرف پانچ منٹ لگے تھے' لیکن اس وقت وہ پانچ منٹ سالار کو پانچ ہزار سال لگ رہے تھے۔ وہ ملک اور وہ شہر اس کے دوستوں اور رشتہ داروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک فون کال کرتا اور وہاں مجمع لگا لیتا۔ لیکن کوئی مجمع کوئی اس کا مسئلہ' اس کی آزمائش ختم نہیں کر سکتا تھا اور آزمائش تھی کہ بلا کی طرح اس کے سر پر آئی تھی' اس سے بھی بڑھ کر اس کی فیملی کے سر پر۔۔۔

وہ ہوٹل کے کمرے میں آکر دروازہ بند کر کے خود پر قابو نہیں رکھ پایا تھا۔ وہ بے اختیار چیخیں مارتا رہا تھا۔ اس ہوٹل کے ساتویں فلور کے ایک ڈبل گلیزڈ شیشوں والے ساؤنڈ پروف کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کیے وہ اس کے ساتھ چپکا پاگلوں کی طرح چلاتا رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جب کئی سال پہلے مارگلہ کی پہاڑیوں پر ایک تاریک رات میں ایک درخت سے بندھا چلاتا رہا تھا۔ بے بسی کی وہی انتہا اس نے آج بھی محسوس کی تھی اور اس سے زیادہ شدت سے محسوس کی تھی۔ تب جو بھی گزر رہا تھا۔ اس کے اپنے اوپر گزر رہا تھا۔ جو بھی ہونا تھا صرف اسے ہونا تھا۔

آج جو بھی گزر رہا تھا' وہ اس کی بیوی اور کم سن بچوں پر گزر رہا تھا اور ان کو پہنچنے والی کسی تکلیف کا تصور بھی سالار سکندر کو جیسے صلیب پر لٹکا رہا تھا۔ اگر کوئی غلطی تھی تو اس کی تھی' اس کی فیملی کا کیا قصور تھا۔۔۔ وہ اسے مار دیتے' پیٹرس ایباکا کی طرح۔۔۔ اسے یہ بھی قبول تھا کہ وہ ایباکا کی طرح اس بستر پر اسی حالت میں پڑا ہوتا' لیکن امامہ' جبریل اور عنایہ اور وہ اس کا وہ بچہ جو ابھی دنیا میں آیا بھی نہیں تھا' ان کا کیا قصور تھا۔

وہ لوگ جو اس کے اعصاب کو شل کرنا چاہتے تھے' وہ اس میں کامیاب ہو رہے تھے۔ وہ اگر اسے گھٹنوں کے بل گرانا چاہتے تھے تو وہ گر گیا تھا۔ وہ اسے اوندھے منہ دیکھنا چاہتے تھے تو وہ اوندھے منہ پڑا تھا۔

وہ رات سالار پر بہت بھاری تھی۔ پتا نہیں وہ کتنی بار ہوٹل سے نکل کر فون بوتھ پر گیا تھا۔ سکندر عثمان کو فون کر کے وہ امامہ اور اپنے بچوں کے بارے میں کسی اطلاع کا پوچھتا اور پھر اسی طرح واپس آجاتا۔ وہ ساری رات ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سو پایا تھا۔ امامہ' جبریل اور عنایہ کے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہے تھے۔

اگلی صبح وہ آفس کے اوقات کے شروع ہونے سے بہت دیر پہلے ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا تھا۔

الیگزنڈر رافیل نے اپنے کمرے میں آتے ہوئے سالار سکندر کو بڑے اطمینان سے دیکھا تھا۔ یہ وہ سالار نہیں تھا جو کل یہاں آیا تھا۔ ایک دن اور ایک رات نے اسے جیسے پہاڑ سے مٹی کر دیا تھا۔

"مجھے پریذیڈنٹ سے ملنا ہے۔"

اس نے آتے ہی جو جملہ کہا تھا' رافیل اس سے اس جملے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا' وہ اس سے کہے گا کہ وہ ان کی تمام شرائط ماننے کے لیے تیار تھا' لیکن وہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔

"پریذیڈنٹ سے ملاقات۔۔۔ بہت مشکل ہے یہ تو۔۔۔ کم از کم اس مہینے میں تو یہ ممکن نہیں ہے۔۔۔ اور پھر اس ملاقات کی ضرورت کیوں پیش آئی تمہیں۔۔۔؟ اگر تمہیں وہ سب کچھ دہرانا ہے جو تم کل یہاں کہہ کر گئے تھے تو وہ میں پریذیڈنٹ تک پہنچا چکا ہوں۔"

رافیل آج اس ٹون میں بات کر رہا تھا جس ٹون میں وہ کل بورڈ روم میں بیٹھا بات کرتا رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے سالار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ وہ ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر رونا نہیں چاہتا تھا' لیکن اس وقت اسے لگ رہا تھا' وہ کسی بھی لمحے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گا اور آخری چیز جو وہ کرنا چاہتا تھا' یہی ایک کام تھا۔

"کنشاسا میں کل سے میری فیملی غائب ہے۔۔۔ میری بیوی۔۔۔ میرا بیٹا۔۔۔ میری بیٹی۔۔۔" اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے اس نے رافیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اوہ... بہت افسوس ہوا... تمہیں فوری طور پر واپس جانا چاہیے کانگو' تاکہ پولیس کی مدد سے اپنی فیملی کو برآمد کرواسکو... جو حالات کانگو میں ہیں ان میں کوئی گمشدہ شخص بہت کم ہی صحیح سلامت ملتا ہے' لیکن پھر بھی..."

رافیل یوں بات کررہا تھا جیسے اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے لہجے' چہرے' آنکھوں میں کہیں سالار کے انکشاف پر افسوس یا ہمدردی نہیں تھی۔ سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میرا پاسپورٹ اور سارے ڈاکومنٹس گم ہوچکے ہیں۔ ہوٹل کے کمرے سے سب کچھ غائب ہوا ہے کل... اور اب میں کل واپس کنشاسا نہیں جاسکتا۔ مجھے ہیڈ کوارٹر کی مدد چاہیے اپنے پاسپورٹ اور دوسری دستاویزات کے لیے... اور مجھے ورلڈ بینک سے فوری طور پر ڈاکومنٹس چاہئیں' تاکہ میں اپنا پاسپورٹ لے سکوں۔"

رافیل نے اس کی بات خاموشی سے سننے کے بعد اسے بڑے ہی ٹھنڈے انداز میں سرد مہری سے کہا۔

"ان حالات میں ورلڈ بینک تمہیں نئے پاسپورٹ کے لیے کوئی لیٹرز جاری نہیں کرسکے گا' کیونکہ تم آج ریزائن کررہے ہو... میرا خیال ہے' تمہیں معمول کے طریقہ کار کے مطابق پاسپورٹ کے لیے اپلائی کرنا چاہیے اور پھر کانگو جانا چاہیے ایک وزیٹر کے طور پر... اگر تم ورلڈ بینک کے ایمپلائی ہوتے تو ہم تمہاری فیملی کے لیے کسی بھی حد تک جاتے' لیکن اب وہ اور ان کا تحفظ ہماری آرگنائزیشن کی ذمہ داری نہیں... تمہارے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ تم کنشاسا میں امریکن ایمبیسی سے رابطہ کرو اور اپنی فیملی کے لیے مدد مانگو یا پھر پاکستانی ایمبیسی سے... تم اور ریجنلی پاکستان سے ہی ہونا؟"

رافیل نے اپنی گفتگو کے اختتام پر بڑے بھول پن سے اس سے یوں پوچھا جیسے اسے یہ اچانک یاد آیا ہو کہ وہ دہری شہریت رکھتا تھا۔

سالار اس کے اس تضحیک آمیز جملے کو شہد کے گھونٹ کی طرح پی گیا۔ ورلڈ بینک کے ایمپلائی کو بلو پاسپورٹ ایشو ہوتا تھا اور اس پاسپورٹ کے حصول کے لیے اسے ایک بار پھر سے ہیڈ کوارٹر سے اس کے لیے لیٹر چاہیے تھا یا پھر ورلڈ بینک اس کی جگہ پر خود اس پاسپورٹ کے لیے اپلائی کرکے اسے پاسپورٹ دلواتا... لیکن اب رافیل کے دوٹوک انکار نے سالار کے ذہنی ہیجان میں اضافہ کردیا تھا۔ زندگی میں کبھی کسی مغربی ادارے سے اسے اتنی شدید نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس دن ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے ہوئے ہوئی تھی۔

وہ اپنی زندگی کے بہترین سال اور بہترین صلاحیتیں مغرب کو دیتا آیا تھا... اقوام متحدہ کے باقی ادارے اور اب ورلڈ بینک... وہ اس ہیڈ کوارٹر میں کل تک ایک خاص اسٹیٹس کے ساتھ آتا رہا تھا اور آج وہ اس سے اس طرح کا برتاؤ کررہے تھے جیسے وہ ایک بھکاری تھا۔ ایک ناکارہ' بے کار آدمی... جس کے پاس اب ورلڈ بینک کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ انہیں اس کی اتنی ہی دیانت داری' اخلاص اور ضمیر چاہیے تھا جو صرف ان کے ادارے اور تہذیب کی ترقی کے لیے ضروری تھا۔ انسانیت' مادہ پرستی کے اس جنگل کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی جسے مغرب ترقی کہتا تھا اور اسی ترقی کے حصول کی خواہش میں وہ بھی ساری عمر سرگرداں رہا تھا۔

بعض لمحے انسانوں کی زندگی میں تبدیلی کے لمحے ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی تبدیلیوں کے... صرف ایک لمحے کی ضرورت ہوتی ہے جو انسان کو بہت ساری زنجیروں سے آزاد کردیتا ہے... سینتیس سالہ زندگی میں آج دوسری بار سالار کی زندگی میں وہ لمحہ آیا تھا۔

پہلی بار مارگلہ کی پہاڑی پر موت کے خوف کی گرفت میں وہ اس طرز زندگی سے تائب ہوگیا تھا جو وہ گزارتا آیا تھا اور آج دوسری بار وہ امامہ اور اپنے بچوں کی موت کے خوف اور ورلڈ بینک میں اپنے سینیرز کے ہاتھوں ملنے والی ہتک اور تذلیل کے بعد وہ فیصلہ کر بیٹھا تھا جو وہ اب تک کرتے ہوئے جھجکتا اور کتراتا رہا تھا۔

بعض خوف سارے خوف کھا جاتے ہیں... سالار سکندر کے ساتھ بھی اس دن یہ ہی ہوا تھا۔ وہاں بیٹھے اس



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے اس دن یہ طے کیا تھا' وہ اگلے دس سال میں ورلڈ بینک سے بڑا ادارہ بنائے گا۔ وہ دنیا کے اس مالیاتی نظام کو الٹ کر رکھ دے گا جس پر مغرب قابض تھا۔ وہ ساری عمر مغربی اداروں میں مغربی تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔ وہ مغرب کا مداح تھا' لیکن وہ مغرب کا مطیع نہیں بن سکتا تھا۔

ذلت بہت کم لوگوں کو مطیع بناتی ہے۔۔۔ تذلیل لوگوں کو منتقم المزاجی سکھاتی ہے۔۔۔ بدلہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔۔۔ سالار' سکندر نے اپنی پروفیشنل زندگی میں پہلی بار ایسی تذلیل چکھی تھی۔۔۔ ہتک۔۔۔ ذلت' تذلیل۔۔۔ جتنے بھی لفظ اس احساس کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں۔ اس کو محسوس ہوئے تھے۔۔۔ مغرب کی مشینری کا ایک بہترین اور کارآمد پرزہ بن کر بھی وہ صرف ایک پرزہ ہی بن سکا تھا جس کی مدت میعاد اور ضرورت ختم ہونے پر اسے ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا جاتا۔۔۔ وہ ساری عمر یہ سمجھتا رہا تھا۔ وہ اپنی قابلیت' اپنی مہارت' اپنے کام سے جزو لاینفک بن چکا تھا۔ وہ خود کو اہم نہیں "اہم ترین" سمجھتا رہا تھا۔ اس کا یہ یقین خوش فہمی نکلی تھی۔

"تم مزید کسی ایشو کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟" الیگزنڈر رافیل نے بظاہر بے نیازی جتاتے ہوئے اس سے کہا۔

"نہیں۔۔۔" وہ مزید کچھ بھی کہے بغیر اٹھ گیا تھا۔ رافیل بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ اسے اپنے بیوی' بچوں کی زندگی کے لیے گڑگڑاتا دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔ اپنے پاسپورٹ کو ایشو کرانے کے لیے ورلڈ بینک کی اپروول اور تعاون کی بھیک مانگتے ہوئے اور پھر آخر کار ان ٹرمز اور کنڈیشنز کو مانتے ہوئے استعفیٰ دینے یا کانگو میں اس پروجیکٹ کو جاری رکھنے کی۔۔۔ جس کے لیے وہ کل یہاں بیٹھا تھا۔ لیکن سالار سکندر ان حالات میں بھی اٹھ کر چلا گیا تھا۔ رافیل کو لگا' اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا تھا۔

ہیڈ کوارٹرز کی عمارت سے اس طرح نکلتے ہوئے سالار کو خود بھی یہ ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ اتنا بے رحم اور بے حس تو نہیں ہو سکتا تھا کہ امامہ اور بچوں کے لیے وہاں کچھ بھی کیے بغیر آجائے۔ وہ وہاں کمپرومائز کرنے گیا تھا۔ اپنی بیوی اور بچوں کی زندگی بچانے کے لیے ان کی شرائط ماننے کی نیت سے وہاں گیا تھا۔ لیکن رافیل کے الفاظ اور رویے نے جیسے سالار سکندر کا ذہن ہی الٹ کر رکھ دیا تھا۔

"میں ان میں سے کسی سے بھی اپنی فیملی کی زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ اگر گڑگڑاؤں گا تو بھی ان میں سے کسی کے سامنے نہیں گڑگڑاؤں گا۔ عزت اور ذلت دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ نے ہمیشہ مجھے عزت دی ہے۔ ذلت جب بھی میرا مقدر بنی ہے میرے فیصلوں' میرے انتخاب سے بنی ہے۔ میں آج بھی اللہ سے ہی عزت مانگوں گا۔۔۔ پھر اگر اللہ مجھے عزت نہیں ذلت دے گا تو میں اللہ کی دی ہوئی ذلت بھی قبول کروں گا' لیکن میں دنیا میں کسی اور شخص سے ذلت نہیں لوں گا۔۔۔ نہ جھکوں گا۔۔۔ نہ کمپرومائز کروں گا۔۔۔ کم از کم اب اس سب کے بعد نہیں۔"

وہ ریت کا ٹیلا بن کر اندر گیا تھا اور آتش فشاں بن کر باہر آیا تھا۔ وہ وہی لمحہ تھا جب اس نے امامہ اور اپنے بچوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگا دی تھیں۔

"امامہ۔۔۔ جبریل۔۔۔ عنایہ۔۔۔ یہ نعمتیں مجھے اللہ نے دی ہیں۔۔۔ کسی انسان سے تو کبھی بھی نہیں ملیں۔۔۔ تو پھر میں انسانوں سے ان کے لیے بھیک کیوں مانگوں۔"

وہ ضدی تھا' لیکن اس نے زندگی میں سوچا کبھی بھی نہیں تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب وہ امامہ اور اپنے بچوں کی زندگیوں کو اپنی ضد کے سامنے قربان کرنے پر تیار ہو جائے گا۔

سالار سکندر کو پھانسنے کے لیے جو پھندا تیار کیا گیا تھا' وہ اس سے بچ کر نکل گیا تھا اور جن لوگوں نے وہ پھندا تیار کیا تھا' انہیں اندازہ نہیں تھا۔ بساط کس طرح پلٹنے والی تھی' وہ اس کو مات دینا چاہتے تھے۔ وہ انہیں شہ مات دینا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

چاہتا تھا۔

"اور اللہ بے شک بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ دن ورلڈ بینک کے لیے بہت بڑی خوش خبری لے کر آیا تھا۔ پیٹرس ایباکا کوما کی حالت میں مر گیا تھا۔ سالار سکندر نے وہ خبر بینک سے واپس ہوٹل آکر ٹی وی پر سنی تھی۔ یہ اس کے لیے ایک اور دھچکا تھا۔ مگر یہ وہ خبر تھی جو اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ پیٹرس ایباکا کی جو حالت دیکھ آیا تھا اس کے بعد اس کا دوبارہ نارمل ہونا ناممکن تھا۔ لیکن وہ رات ورلڈ بیک کے لیے 'سیاہ ترین رات تھی۔

پیٹرس ایباکا مرنے سے پہلے ورلڈ بینک کی موت کا سامان کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ایکسکیوزمی۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کر بار کی طرف چلی گئی تھی۔ اس کی نظروں نے جیکی کا تعاقب کیا۔ وہ بار کاؤنٹر پر بارٹینڈر سے بات کر رہی تھی۔ اس کے سیاہ بیک لیس لباس سے اس کی سفید خوب صورت پشت کمر کے خم تک نظر آ رہی تھی۔

اس نے نظر ہٹاتے ہوئے اپنے سامنے پڑے اورنج ڈرنک کا ایک گھونٹ لیا۔ بہت عرصے کے بعد اس نے کسی عورت کے جسم پر غور کیا تھا اور بہت عرصے کے بعد وہ کسی عورت کے ساتھ اکیلے کسی بار میں بیٹھا تھا۔ وہ ایک ہوٹل کا بار روم تھا' لیکن وہ ایسی کسی جگہ پر بھی بہت عرصے کے بعد آیا تھا۔

وہ ہاتھ میں پکڑے گلاس سے دوسرا گھونٹ لے رہا تھا جب جیکی دو شیمپین گلاسز کے ساتھ واپس آگئی تھی۔

"میں نہیں پیتا۔" اس نے ایک گلاس اپنے سامنے رکھنے پر چونک کر اسے یاد دلایا تھا۔

"یہ شیمپین ہے۔" جیکی نے جواباً" ایک کندھے کو ہلاتے ہوئے بے حد گہری مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔ اس کا اپنا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔

"شیمپین شراب نہیں ہے کیا؟" اس نے جواباً" جیسے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ وہ ٹیبل پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا سے اب ایک سگریٹ نکال کر لائٹر کی مدد سے سلگا رہا تھا۔

جیکی نے آگے جھکتے ہوئے بڑی سہولت سے اس کے ہونٹوں میں دبا سگریٹ نکال لیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی یہ حرکت بے حد غیر متوقع تھی۔ وہ اب اسی سگریٹ کو اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبائے بائیں ہاتھ میں شیمپین گلاس پکڑے مسکراتے ہوئے سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔

اس نے نظریں چراتے ہوئے سگریٹ کی ڈبیا سے ایک اور سگریٹ نکال لیا۔

"آؤ' ڈانس کریں۔" وہ جیکی کی آفر پر ایک بار پھر چونکا۔ وہ ڈانس فلور پر رقص کرتے چند جوڑوں کو دیکھ رہی تھی۔

بار روم میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے اور ان میں سے بھی صرف چند ایک ہی اس ڈانس فلور پر موجود تھے۔ جنہیں واقعی ڈانس کرنا تھا' وہ اسی ہوٹل کے نائٹ کلب میں موجود تھے۔

"میں ڈانس نہیں کرتا۔" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے لائٹر رکھا۔

"آتا نہیں ہے؟" جیکی ہنسی تھی۔

"پسند نہیں ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔ وہ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ اس نے راکھ جھاڑنے کے بہانے نظریں چرائیں۔ جیکی کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی

www.Paksociety.com



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔

"شراب کبھی نہیں پی تم نے؟"

اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کچھ آگے جھکتے ہوئے پوچھا۔ اس شخص کی نظریں ایک لمحہ کے لیے گلاس سے الجھی تھیں، پھر اس نے جیکی کو دیکھا۔

"بہت عرصہ پہلے۔" اس نے جیسے اعتراف کیا۔

"شیمپین؟" جیکی نے مصنوعی حیرت کے ساتھ کہا۔

"یہ بھی۔" بے تاثر چہرے کے ساتھ اس نے ڈانس فلور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

گلاس دوبارہ اٹھاتے ہوئے سامنے بیٹھے ہوئے مرد کے چہرے پر نظریں جمائے جیکی نے اپنی زندگی میں آنے والے پرکشش ترین مردوں کی فہرست میں اس کا شمار کیا تھا۔ وہ اس فہرست میں سب سے اوپر تھا۔ یہ اس کے جسمانی خدوخال نہیں تھے۔ جو اسے سب میں ممتاز کرتے تھے۔ اس کی زندگی میں شکل وصورت کے اعتبار سے اس سے زیادہ خوب صورت مرد آئے تھے۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص میں کچھ اور تھا جو اسے بے حد منفرد سب سے الگ بنا رہا تھا۔ اس کی بھاری مردانہ آواز، شائستہ رویہ، ذہین تیز اور گہری آنکھیں اس کی مسکراہٹ یا پھر اس کی تمکنت اور رکھ رکھاؤ، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف ملتفت ہو رہی تھی اور بری طرح ہو رہی تھی اور اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ وہ دعوے سے کہہ سکتی تھی کہ وہ مرد کسی بھی عورت کو متوجہ کر سکتا تھا۔ اس نے اس کے کریکٹر پروفائل میں پڑھا تھا کہ وہ عیاش نہیں تھا۔ اسے حیرت تھی، وہ کیوں نہیں تھا۔ اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس پر نظریں جمائے اس نے سوچا اور بالکل اسی لمحے اس شخص نے ڈانس فلور سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ جیکی کی مسکراہٹ بے اختیار گہری ہوئی تھی۔ وہ بھی بے مقصد مسکرا دیا تھا۔ وہ بہت عرصے کے بعد کسی عورت کی کمپنی کو اتنا انجوائے کر رہا تھا۔ وہ خوب صورت تھی، اسمارٹ تھی اور وہ الجھا ہوا تھا، نہ ہوتا تو یہاں اس وقت دو گھنٹے ایک اجنبی عورت کے ساتھ کبھی نہ بیٹھا ہوتا۔

"تمہاری شیمپین!" جیکی نے اسے ایک بار پھر یاد دلایا۔

"تم لے سکتی ہو۔" اس نے جواباً گلاس کو اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اگر پہلے پیتے تھے تو اب اس میں کیا برائی نظر آگئی تمہیں؟" جیکی اس بار سنجیدہ ہوئی تھی۔

"لطف حاصل کرنے کے لیے پیتا تھا، جب لطف ملنا ختم ہو گیا تو شراب چھوڑ دی میں نے۔"

وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنسی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ جیکی دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھتے ہوئے آگے جھکی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیا تم جانتے ہو، مجھے تم میں ایک ساحرانہ کشش محسوس ہوتی ہے۔"

وہ مسکرایا تھا، یوں جیسے اس کے جملے سے محظوظ ہوا ہو۔

"زہے نصیب۔" اس نے جواباً کہا تھا۔

جیکی نے بڑے غیر محسوس انداز میں میز پر رکھے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ہاتھ ہٹانا چاہتا تھا، لیکن چاہتے ہوئے بھی نہیں ہٹا سکا۔ وہ اس کے ہاتھ کی پشت پر بظاہر غیر محسوس انداز میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے، پھر جیکی نے کہا۔

"کیا تم ایک رات کے تعلق پر یقین رکھتے ہو؟"

جواب فوری آیا تھا۔ "بالکل۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

عمیرہ احمد

# آب حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص — سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سرا مل جاتا ہے۔



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
READING Section

J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

Downloaded from paksociety.com

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نیسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی، اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

11

گیارہویں قسط



READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.Paksociety.com

## حاصل و محصول

نیویارک میں واقع امریکہ کے سب سے بڑے میڈیا ڈسٹرکٹ مڈ ٹاؤن مین ہٹن کے کولمبس سرکل میں واقع ٹائم وارنر سینٹر کی عمارت کے سامنے کھڑے پیٹرس ایباکا کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے چمک رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر میں اس عمارت کے اندر واقع سی این این کے اسٹوڈیوز میں امریکہ کے ممتاز ترین اخباری صحافیوں میں سے ایک اینڈرسن کوپر سے اس کے پروگرام 360 کے سلسلے میں ملاقات کرنے والا تھا۔

اینڈرسن کوپر دو ہفتے بعد کانگو میں بارانی جنگلات کے حوالے سے ایک پروگرام کرنے جا رہا تھا۔ اس نے انگلینڈ اور یورپ کے اخبارات میں پیٹرس ایباکا کے انٹرویوز اور پگمیز کی بقا کے لیے چلائی جانے والی اس کی مہم کے بارے میں بنیادی معلومات لینے کے بعد اپنی ٹیم کے ایک فرد کے ذریعے اس سے رابطہ کیا تھا۔۔۔ اور آج اسے کوپر کے ساتھ ایک خفیہ ملاقات کرنی تھی اور پیٹرس ایباکا خوشی سے بے قابو تھا۔ کانگو کے تاریک جنگلات میں بسنے والے پگمیز کی جدوجہد کی کہانی، کبھی روشنیوں سے چمکتی تہذیب یافتہ دنیا کے اس جنگل میں سنی جا سکتی تھی، ایباکا کو اس کی توقع تھی پر یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام اتنی جلدی بھی ہو سکتا تھا۔ وہ واشنگٹن میں کئی دنوں سے کئی نیوز چینلز کے لوگوں سے ملتا رہا تھا اور امید و ناامیدی کے درمیان لڑھکتا پھر رہا تھا اور ان ہی نیوز چینلز پر مختلف حوالہ جات کے ذریعے رابطہ کرتے کرتے اسے بغیر کسی حوالے کے اور اچانک ـــــ اینڈرسن کوپر کی طرف سے ملنے والی وہ کال غیر یقینی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نعمت غیر مترقبہ بھی تھی۔

کئی سالوں سے کی جانے والی اس کی وہ بے نام جدوجہد اگر سی این این پر کوپر کے پروگرام میں ہائی لائٹ ہوتی اور دنیا کے سامنے آتی تو اس کے بعد ایباکا کے لیے بہت ساری چیزیں آسان ہو جاتیں۔۔۔ اور اس کے لیے سب کچھ جتنا آسان ہو جاتا۔۔۔ ورلڈ بینک اور اس سے منسلک عالمی قوتوں کے لیے اس پروجیکٹ کو دنیا کی نظروں سے چھپائے اسی طرح چلائے جاتے رہنا اتنا ہی مشکل ہو جاتا۔۔۔ بین الاقوامی میڈیا کی کوریج اور اس کوریج کے نتیجے میں ہونے والی تنقید کا سامنا کرنا مشکل ہوتا پروجیکٹ ختم ہونے کے خدشات تو جو پیدا ہوتے سو ہوتے لیکن ورلڈ بینک کے لیے افریقہ سے دوسرے ممالک میں اسی طرح کے نئے پروجیکٹس کے ٹھیکے اور آغاز مشکل سے مشکل ہو جاتا۔۔۔ وہ بونا جسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بوتل رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے اور اس میں کامیاب بھی تھے۔ یک دم جن بن گیا تھا اور کسی جن کو بوتل میں واپس قید کرنے سے زیادہ آسان اس کی جان لے لینا تھا۔

ایباکا کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اینڈرسن کوپر کی طرف سے ملنے والی اس کال نے اس کی زندگی اور موت کے حوالے سے بھی فیصلہ کر دیا تھا۔۔۔ مگر تاخیر بس تھوڑی سی ہوئی تھی اس کی نگرانی کرنے والے لوگوں سے۔۔۔ ایک سراسیمگی اور بدحواسی پھیلی تھی ان لوگوں میں جنہوں نے یہ طے کرنا تھا کہ اب اچانک سی این این کے منظر میں آجانے کے بعد وہ فوری طور پر ایباکا کا کیا کریں۔۔۔ تشویش اس بات پر بھی ہوئی تھی کہ اگر ایباکا اور پگمیز کے حوالے سے کوپر نے پروگرام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو چوٹی کے اور کتنے ایسے صحافی تھے جو اس پروجیکٹ کے حوالے سے پروگرام کرنے کی تیاریوں میں تھے۔۔۔

ایباکا جن چھوٹے موٹے نیوز چینلز اور جرنلسٹس کو "بڑا" اور "طاقتور" سمجھ کر واشنگٹن میں ان کے ساتھ گھنٹوں گزار کر آتا رہا تھا۔۔۔ وہ سب پہلے ہی ایباکا کی نگرانی کرنے والے لوگوں کی فہرست میں شامل تھے۔۔۔ ان سے ایباکا کے حوالے سے پہلے ہی بات کر لی گئی تھی اور انہیں اس پروجیکٹ اور اس ایشو کی کوریج کے حوالے سے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی ہدایات بھی پہنچائی گئی تھیں کہ امریکی مفادات کے لیے اس پروجیکٹ کے حوالے سے کوئی منفی خبر کی کوریج اور رپورٹ کس قدر نقصان دہ ہو سکتی تھی۔۔۔ اور ان چھوٹے چینلز اور نیوز جرنلسٹس کو تابع کرنا

READING Section



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

آسان تھا۔ سی این این جیسے بڑے ادارے کو بھی امریکن مفادات کو ہر چیز پر بالاتر رکھنا کی سوچ کے تابع رکھنا مشکل نہیں تھا مگر مشکل تھا تو ان نیوز جرنلسٹس کی عالمی مقبولیت اور پہنچ پر کنٹرول رکھنا جو سی این این پر جب بھی کسی ایشو کو کتنا بھی امریکی مفادات کو بالاتر رکھنے کی پالیسی کے باوجود اٹھاتے وہ دنیا میں کسی نہ کسی نئے تنازعے کو جنم دے دیتے۔۔۔

اور یہاں بھی ایباکا کو مانیٹر کرنے والے لوگوں کو اچانک درپیش آنے والا چیلنج یہی تھا۔ اگر وہ پروگرام کوویر ایباکا سے پہلے پیش کرنے کا ارادہ نہ کر چکا ہوتا تو سی آئی اے کے لیے کوویر کو اس آفیشنسی صحافت سے روکنے کا واحد حل یہ تھا کہ ایباکا کو اس تک کسی بھی قیمت پر نہ پہنچنے دیا جاتا لیکن یہاں کوویر۔۔۔ ایباکا سے اس اسٹیج پر رابطہ کر رہا تھا جب مبادہ اور اس کی ٹیم پہلے ہی اس ایشو پر بہت زیادہ کام کرنے کے بعد کانگو روانگی کی تیاریوں میں تھی اور اب اس صورت حال میں کیا جاتا۔۔۔! یہ تھا وہ چیلنج جس نے فوری طور پر ایباکا اور کوویر کی ملاقات کے حوالے سے سی آئی اے کو پریشان کیا تھا اور اس پریشانی میں اضافہ تب ہو گیا تھا جب ایباکا اس کال کے ملنے کے فوراً بعد ہی واشنگٹن سے نیویارک کے لیے چل پڑا تھا اور جب تک ان کا اگلا لائحہ عمل فائنل ہو سکا ایباکا ٹائم وارنر سینٹر پہنچ چکا تھا۔

اینڈرسن کوویر کے ساتھ دو گھنٹے کی ایک گرما گرم نشست کے بعد وہ جب سی این این اسٹوڈیوز سے باہر نکلا تھا تو ایباکا کا جوش پہلے سے بھی زیادہ بڑھ چکا تھا۔

اسے پہلی بار سالار سے رابطے کا خیال آیا تھا کیونکہ اینڈرسن کوویر کے ساتھ سوال و جواب کے اس آف کیمرہ سیشن میں سالار سکندر کا ذکر کئی بار آیا تھا۔ اس نے کئی بار اس کے لیے تعریفی جملے ادا کیے تھے۔۔۔ کیسے سالار سکندر نے اس پروجیکٹ کے حوالے سے اس کے تحفظات کو سنجیدگی سے سنا۔ کیسے وہ چھ ماہ اس کے ساتھ ان جنگلات میں جا جا کر مقامی لوگوں کے ساتھ حقائق اکٹھا کرتا رہا۔۔۔ اور کیسے اس نے ورلڈ بینک کو جمع کیے جانے والے حقائق اور تحفظات پر مشتمل رپورٹ بھیجی تھی جو اس پروجیکٹ کے اختیارات کو ہی نہیں اس کی بنیاد کو بھی قابل اعتراض گردانتی تھی۔ سالار سکندر کے لیے اپنے ستائشی جذبات کوویر تک پہنچاتے ہوئے ایباکا کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ اس نے سالار سکندر کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

کوویر اس پروجیکٹ کے حوالے سے جن مزید لوگوں سے بات چیت کرنے والا تھا ان میں سالار سکندر کا نام سرفہرست تھا۔۔۔ سی آئی اے کو اس کا اندازہ تھا۔۔۔ یہ وہ دن تھا جب سالار سکندر سفر کرتے ہوئے رات کو واشنگٹن پہنچ رہا تھا اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ بدقسمتی اس سے پہلے اس کے انتظار میں وہاں بیٹھی تھی۔

ایباکا نے اس عمارت سے نکلنے کے بعد سینٹرل پارک کی طرف جاتے ہوئے بے حد خوشی کے عالم میں سالار کو ٹیکسٹ کیا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اب سی این این تک رسائی حاصل کر چکا تھا اور کوویر ہی کے حوالے سے اسے واشنگٹن کے سی این این اسٹوڈیوز میں اسی کی ٹیم کے چند اور لوگوں سے بھی ملنے کا موقع مل گیا تھا۔۔۔ اور ایباکا ساتویں آسمان پر تھا۔

اسے اب کوویر کے ساتھ دو ہفتے کے بعد کانگو واپس جانا تھا جہاں وہ اینڈرسن کوویر کو اس پروجیکٹ کے حوالے سے کی جانے والی تحقیقات میں مدد دیتا اور وہ خواب جو کئی سالوں سے صرف خواب تھا پیٹرسن ایباکا اسے بالآخر حقیقت بنتا دیکھنے لگا تھا۔ اس ٹیکسٹ میں ایباکا نے اسے بتایا تھا کہ وہ بے حد خوش تھا۔۔۔ بے حد۔۔۔ پیٹرس ایباکا چھوٹے موٹے نیوز چینلز اور اخبارات میں اس مسئلے کو لے کر پھرتا اور بولتا رہا تھا اور خوار ہوتا رہا تھا۔۔۔ اینڈرسن کوویر سی این این پر پرائم ٹائم میں امریکہ کے مقبول ترین پروگرامز میں سے ایک 360 میں جب اسی مسئلے پر بات کرتا تو صرف عالمی افق پر ہی تہلکہ نہیں مچتا بلکہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور ورلڈ بینک کے اندر بھگدڑ



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
READING Section

مچنے کے ساتھ ساتھ ان دوسری عالمی طاقتوں کے لیے بھی پریشانی کے آثار پیدا ہوتے جو اس پروجیکٹ میں حصہ دار تھے اور جن کے ہاتھ ان پگمیز کے خون سے رنگے جا رہے تھے۔

وہ ٹیکسٹ بہت لمبا تھا۔ اس میں اور بھی بہت کچھ تھا۔۔۔ اور پیٹرس کا جوش و خروش وہیں ختم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس بہت لمبے ٹیکسٹ کو کرتے کرتے ای میل کر دیا تھا۔ سالار سکندر اس وقت اپنی فلائٹ پر تھا اور کچھ گھنٹوں کے بعد وہ جب واشنگٹن اترا تھا تب تک اس کے رابطوں کے تمام ذرائع زیر نگرانی آ چکے تھے۔ پیٹرس ایباکا کی وہ آخری ای میل سالار سکندر کو اس کی موت کے بعد ملی تھی۔ لیکن ان لوگوں کو سالار سکندر کے جہاز اترنے سے بھی کئی گھنٹے پہلے مل گئی تھی جو پیٹرس ایباکا کی زندگی اور موت کے حوالے سے فیصلہ کر رہے تھے۔

ایباکا کی فوری موت انہیں نہیں چاہیے تھی۔ انہیں فی الحال کچھ گھنٹوں کے لیے اس کی زندگی چاہیے تھی۔ اپنی تحویل میں ایباکا کو رکھتے ہوئے وہ اب ایباکا ہی کے ذریعے اس پورے کیس کو بند کرنا چاہتے تھے۔ وہ پنڈورا باکس جسے ایباکا نے کھولا تھا' وہ ایباکا کے ہاتھوں ہی بند کروانا چاہتے تھے۔۔۔ اور اس کے بعد وہ ایباکا سے جان چھڑا لیتے۔۔۔ اس کی طبعی موت کے ذریعے۔

بعض اوقات کسی شخص کی زندگی کسی دوسرے کی موت بن جاتی ہے۔۔۔ اور کسی دوسرے کی موت کسی اور کی زندگی۔۔۔ ایباکا کی موت کے فیصلے نے سی آئی اے کی فوری طور پر سالار سکندر کو مار دینے کی حکمت عملی بدل دی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے سالار سکندر کو بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں ہونے والے مذاکرات کے بعد اس کے انکار اور معاملہ حل نہ کرنے کی صورت میں ایک "حادثاتی موت" کا سامنا کرنا تھا۔ اینڈرسن کو ویر سے ایباکا کی ہونے والی اچانک ملاقات نے سی آئی اے کو یک دم پسپا کر دیا تھا۔ وہ ایباکا اور سالار دونوں کو اکٹھا نہیں مار سکتے تھے۔۔۔ شاید مارنے کا سوچ ہی لیتے اگر اتفاقی طور پر وہ دونوں ایک ہی وقت میں امریکہ میں موجود نہ ہوتے اور وہ بھی دو قریبی شہروں میں۔۔۔ وہ ایسا کوئی رسک نہیں لے سکتے تھے کہ کسی تفتیش شروع ہونے کی صورت میں ایباکا اور سالار کی طبعی اموات کے درمیان کوئی اور قدرتی تعلق نکال لیا جاتا۔

سالار کو فی الحال صرف خوف زدہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور سی آئی اے کو اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے غلط حکمت عملی' غلط آدمی پر لاگو کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پیٹرس ایباکا کو چند گھنٹوں کے بعد بروکلین کے ایک ایسے علاقے کی ایک تنگ و تاریک گلی میں روکا گیا تھا جہاں ایک قریبی عمارت میں ایباکا کو اپنے ایک دوست سے ملنا تھا۔ سی آئی اے کا خیال تھا ایباکا ان کے لیے حلوہ تھا جسے وہ بہت آرام سے اسے پکڑ کر لے آتے۔ ایسا نہیں ہوا تھا۔ ایباکا ان دو افراد سے بڑی بے جگری سے لڑا تھا جنہوں نے اچانک اس کے قریب اپنی گاڑی روک کر اسے ریوالور دکھاتے ہوئے اندر بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ساری زندگی امریکہ کی مہذب دنیا میں مہذب طور طریقوں کے ساتھ گزاری تھی لیکن جنگل اور جنگلی زندگی اس کی سرشت اور جبلت میں تھی' اپنا دفاع کرنا اسے آتا تھا۔

وہ ان تربیت یافتہ گماشتوں کے قابو میں نہیں آیا تھا۔۔۔ پستہ قامت ہونے کے باوجود وہ سخت جان اور مضبوط تھا۔ وہ پٹتا اور پیٹتا رہا تھا۔ اس سڑک سے گزرتے ہوئے اکا دکا لوگوں میں سے کسی نے ایک سیاہ فام اور دو سفید فاموں کے درمیان ہونے والی اس دھینگا مشتی کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گزرنے والے سفید فام تھے اور پیٹرس ایباکا ان کی ملامتی نظروں کا' معاملے کو نہ سمجھتے ہوئے بھی نشانہ تھا۔ جرم ہمیشہ کالا کرتا تھا۔۔۔ قصوروار ہمیشہ کالا ہوتا تھا۔ وہ فلاسفی پاس سے گزر جانے والے لوگوں کے ذہنوں کے ساتھ ساتھ نظروں میں بھی تھی۔

وہ ایسا معاشرہ نہیں تھا جو کسی سیاہ فام کو پٹتے دیکھ کر انسانیت کے جذبے کے تحت تڑپ جاتا اور مدد کے لیے بن بلائے آ جاتا۔۔۔ اور یہاں تو ایک ایسا سیاہ فام تھا جو پٹ رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ پیٹ بھی رہا تھا۔ خود لہولہان تھا تو ان



WWW.PAKSOCIETY.COM
READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

دو سفید فاموں کو بھی لہولہان کر چکا تھا۔ پتا نہیں یہ ایباکا کی بدقسمتی تھی۔ ان دونوں ایجنٹس کی یا پھر سی آئی اے کی ..... کہ لڑتے لڑتے ریوالور ایباکا کے ہاتھ میں آگیا تھا اور ایک بار ریوالور ہاتھ میں آنے پر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ان دونوں افراد پر گولیاں چلا دی تھیں۔ گولی ایک کو لگی تھی لیکن دوسرا خود پر ہونے والے فائر سے بہت پہلے اپنا ریوالور نکال کر ایباکا پر دو فائر کر چکا تھا جو اس کے سینے میں لگے تھے۔

یکے بعد دیگرے ہونے والے ان تین فائرز نے اس سڑک پر چلتے راہ گیر کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا اور ان ہی میں سے کسی نے پولیس کو بھی فون کیا تھا لیکن پولیس کے آنے سے پہلے ہی وہ دونوں ایجنٹ شدید زخمی حالت میں تڑپتے ایباکا کو گاڑی میں ڈال کر فرار ہو گئے تھے۔ جس ایجنٹ کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ وہ ہوش و حواس میں تھا اور اپنی گاڑی میں ایباکا کو لے کر فرار ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے سرپرستوں کو سارے واقعے سے انفارم کر دیا تھا۔

ایباکا کی وہ حالت اس دن سی آئی اے کے لیے دوسرا جھٹکا تھی۔ انہیں ایباکا صحیح سلامت کچھ گھنٹوں کے لیے چاہیے تھا تاکہ اس کے ذریعے ان تمام چیزوں کو بھی نابود کر سکتے جو ایباکا کی موت کی صورت میں کسی اور کے ہاتھ لگ جانے کی صورت میں ان کے لیے کوئی اور پیٹرس ایباکا کھڑا کر دیتا۔ سی آئی اے کو یہ پتا تھا کہ ایباکا کے پاس موجود کاغذات کی ہزاروں نہیں تو کم از کم سینکڑوں کاپیاں تھیں جو ایباکا کا مختلف لوگوں کے پاس رکھوا تا آرہا تھا۔ پتا نہیں یہ احتیاط تھی یا کوئی خوف یا کوئی حکمت عملی، لیکن یہ وہ واحد حفاظتی تدبیر تھی جو ایباکا کے ذہن میں ابھرنے والے خدشات کا ایک حل تھا اور یہ خدشات اس وقت ابھرنا شروع ہوئے تھے جب ایک سال پہلے پہلی بار کچھ لوگوں نے اس سے رابطہ کر کے اس پورے معاملے سے پیچھے ہٹ جانے کے عوض رشوت دینے کی کوشش کی تھی۔ رشوت شاید ایک بہت چھوٹا اور گھٹیا لفظ تھا اس سب کے لیے جو اسے آفر کیا گیا تھا۔ اگر بلینک چیک کسی کو صرف روپے کے لیے پیش کیا جاتا تھا تو ایباکا کو اس مقصد سے پیچھے ہٹنے اور دوسرے لفظوں میں اپنے لوگوں کی زندگی بیچ دینے کے عوض ہر چیز کے حوالے سے ایک بلینک چیک پیش کیا گیا تھا..... کوئی بھی ایسی چیز جو ایباکا کی خواہش ہوتی..... کوئی بھی چھوٹی سے چھوٹی، بڑی سے بڑی.....

ایباکا کا انکار، اقرار میں نہیں بدلا تھا۔ قیمت ہمیشہ اقرار کی ہوتی ہے "انکار انمول" ہوتا ہے..... بکنے والے آدمیوں کے بیچ میں نہ بکنے والا آدمی کانٹے کی طرح چبھتے ہوئے بھی ہیرے کی طرح چمکتا ہے اور سی آئی اے "ہیروں کے کاروبار" میں مہارت رکھنے کا دعوا رکھتی تھی۔

ان پیش کشوں اور اس انکار کے بعد ایباکا کو پہلی بار یہ خدشات لاحق ہونے لگے تھے کہ اگر اسے خریدا نہیں جا سکا تو پھر اسے مارا جا سکتا ہے..... اور یہ خدشہ ہی وہ چیز تھی جس نے ایباکا کو اپنے بہت سے دوستوں اور ساتھیوں کے پاس ان دستاویزات کی کاپیاں رکھوانے پر مجبور کرنا شروع کر دیا تھا۔ سی آئی اے کو اس کی بھی خبر تھی۔ ایباکا نے اگر سینکڑوں کاپیاں امریکہ اور کانگو اور انگلینڈ میں اپنے دوستوں کے پاس رکھوائی تھیں تو سی آئی اے کو ان سینکڑوں لوگوں کی مکمل معلومات تھیں..... وہ دستاویزات ہر اس جگہ سے چوری کر کے ان کی جگہ کچھ اور ڈاکومنٹس رکھ دی جاتی تھیں اور ایباکا کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوا تھا کہ اس کے پیچھے اس پروجیکٹ کے حوالے سے سارے سراغ مٹائے جاتے رہے تھے۔

فی الحال دنیا میں اب صرف دو شخص تھے جن کے پاس وہ دستاویزات اصلی شکل میں تھیں، کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر..... پیٹرس ایباکا اور سالار سکندر..... پیٹرس ایباکا اب موت اور زندگی کی کشمکش میں تھا اور سالار سکندر اگلے دن خوار ہونے والا تھا مگر سی آئی اے کے لیے فی الحال سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ وہ ایباکا کے دستخط کیسے حاصل کرتے، جن کی انہیں فوری ضرورت تھی تاکہ وہ اس کے وہ لاکرز کھلوا سکتے جہاں اس کی اصل دستاویزات تھیں..... ان کی



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
READING Section

حکمت عملی یہ تھی کہ وہ ان اصلی دستاویزات کو حاصل کرنے کے بعد ایباکا کو ختم کر دیتے مگر سب کچھ اس سے الٹ ہوا تھا۔

پلان اے اور پلان بی ناکام ہو چکا تھا۔ اب سی آئی اے کو پلان سی سے کام لینا تھا لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایباکا کے پاس ایک پلان ڈی تھا جس کا انہیں کبھی پتا نہیں چل سکا تھا۔۔۔ وہ کانگو میں اپنی ایک گرل فرینڈ سے پاس ایک وصیت چھوڑ کر آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

امامہ کو اندازہ نہیں تھا۔ وہ کتنی دیر بے ہوشی کی حالت میں رہی تھی یا رکھی گئی تھی مگر بے ہوشی جب ختم ہونا شروع ہوئی تھی تو اس نے جیسے بے اختیاری کے عالم میں سب سے پہلے اس وجود کو ڈھونڈنا شروع کیا تھا جسے اس نے پہلی اور آخری بار آپریشن تھیٹر میں بے ہوش ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔ تکلیف کی حالت میں بھی اسے یاد تھا کسی نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک لڑکا تھا۔

درد سے بے حال اس نے محمد حسین سکندر کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے اسے چوما تھا اور پھر اسے چومتی چلی گئی تھی۔ وہ بے حد کمزور تھا اس کی بڑی دو اولادوں کے برعکس بے حد کمزور۔۔۔ اور وجہ اس کی قبل از وقت پیدائش تھی۔ وہ تین ہفتے قبل دنیا میں آیا تھا۔۔۔ نیم غنودگی میں وہ اپنا بستر ٹٹولتی رہی۔

اس بات کا احساس کیے بغیر کہ وہ نوزائیدہ بچہ اس کے بستر پر نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر اسے بے مقصد تلاش کرتے رہنے کے بعد اسے اچانک یاد آگیا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہو سکتا تھا۔ بے ہوشی کی دوا کا اثر آہستہ آہستہ زائل ہونا شروع ہو رہا تھا۔ اس کی یادداشت جیسے آہستہ آہستہ واپس آرہی تھی۔۔۔ دماغ نے کام کرنا شروع کیا تھا تو آہستہ آہستہ اسے سب یاد آنے لگے تھے۔۔۔ جبریل۔۔۔ عنایہ۔۔۔ سالار۔ وہ کچھ بے چین ہوئی تھی جبریل اور عنایہ کہاں تھے؟ پیڈی کہاں تھی؟ اور سالار؟ کیا اس کو پتا تھا اس کی اس حالت کے بارے میں۔

اس نے بھاری سر اور آنکھوں کے ساتھ اس کمرے کا جائزہ لیا تھا جس میں وہ تھی۔ وہ ایک ہاسپٹل کا وی آئی پی روم تھا اور ایک ساؤنڈ پروف کمرہ، جس کی کھڑکیوں کے سامنے بلائنڈز تھے اور امامہ اس ذہنی حالت میں فوری طور پر یہ اندازہ نہیں کر پائی تھی کہ وہ دن تھا یا رات اور وقت!۔۔۔ وقت کیا ہو رہا تھا۔۔۔ اس نے وقت کا خیال آنے پر کمرے کی کسی دیوار پر دیوار گیر تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہاں کوئی وال کلاک نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا وہ آپریشن کے بعد اس کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے سلائی گئی تھی اور اب وہ ہوش میں آئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ دو دن کے بعد ہوش میں آرہی تھی۔ امامہ نے یاد کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ وہاں کیسے آئی تھی۔ ذہن پر زور دے دے کر۔

☼ ☼ ☼

سی آئی اے کے لیے سب سے بڑی پریشانی سالار کی فیملی تھی۔ انہیں غائب کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا مگر انہیں یہ احساس دلائے بغیر غائب کرنا کہ انہیں غائب کیا جا رہا تھا سب سے مشکل کام تھا۔ بینک کے کرتا دھرتاؤں کو ابھی سالار سے مذاکرات کرنے تھے اور ان مذاکرات کے نتیجے میں اگر وہ مان جاتا تو پھر اپنی فیملی کے ساتھ ہونے والے کسی برے سلوک پر وہ ردعمل کا اظہار کر سکتا تھا۔۔۔ وہ اسے یہ سراغ نہیں دینا چاہتے تھے کہ ورلڈ بینک کے علاوہ کوئی دوسری طاقت اس سب میں ملوث تھی۔

سالار جس رات واشنگٹن کے لیے روانہ ہوا تھا اس کے اگلے دن امامہ کی گائنا کولوجسٹ نے اسے فون کیا تھا۔ امامہ کے معائنے کی تاریخ تین دن بعد کی تھی۔ اس کی امریکن ڈاکٹر نے اسے اسی دن ایمرجنسی میں آنے کے لیے



WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
READING Section

کہا کیونکہ اسے کسی میڈیکل کیمپ میں شرکت کے لیے اگلے ایک ہفتہ کے لیے گھانا میں رہنا تھا۔ اس کی سیکریٹری نے امامہ سے کہا تھا کہ وہ اپنی تمام اپائنٹمنٹس ری شیڈول کر رہی ہے اور اس نے امامہ کو آج کے دن کا کہا تھا۔ امامہ نے کسی غور و خوض کے بغیر جانے کی ہامی بھرلی تھی۔ وہ اسے ایک معمول کی بات سمجھ رہی تھی اور اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا اگر سالار سکندر سی آئی اے کے ہاتھوں بے بس ہو رہا تھا تو امامہ تو کوئی شے ہی نہیں تھی۔

وہ ہمیشہ کی طرح جبریل اور عنایہ کے ساتھ پیڈی کو بھی ہسپتال لے کر گئی تھی۔ وہ کنشاسا کے بہترین اسپتالوں میں سے ایک تھا کیونکہ وہاں پر زیادہ تر غیر ملکی ملٹی نیشنل کمپنیز اور سفارت کاروں کا علاج ہوتا تھا سالار اس وقت اپنی فلائٹ پر تھا اور امامہ کا خیال تھا وہ جب تک واشنگٹن پہنچتا وہ اس سے بہت پہلے واپس گھر آجاتی۔ لیکن وہ واپس گھر نہیں آسکی تھی۔

اس کی ڈاکٹر نے اس کا الٹرا ساؤنڈ کرنے کے بعد کچھ تشویش کے عالم میں اس سے کہا تھا کہ اسے بچے کی حرکت ابنارمل محسوس ہو رہی ہے۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ اسے کچھ اور ٹیسٹ کروانے ہوں گے اور ساتھ اسے کچھ انجیکشن بھی لینا ہوں گے۔ امامہ کو تشویش ہوئی تھی تو صرف یہ کہ سالار وہاں نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے ہمیشہ اس کے ساتھ ہی وہاں آئی تھی۔ ایسے معائنوں کے لیے لیکن اسے اپنے بچے کے حوالے سے کوئی فکر نہیں تھی، کیونکہ وہ بچے کی حرکت کی ابنارملٹی کو بھی ایک اتفاقی چیز سمجھ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے فوری طور پر ہاسپٹل میں کچھ گھنٹوں کے لیے یہ کہہ کر ایڈمٹ کیا تھا کہ انہیں اس کو زیر نگرانی رکھنا تھا۔

اسے ایک کمرے میں شفٹ کیا گیا تھا اور جو انجکشن امامہ کو دیے گئے تھے وہ درد روکنے والے انجکشن تھے۔ امامہ کو گھر سے غائب اور سالار اور اپنی کسی اور فیملی ممبر سے رابطہ منقطع رکھنے کے لیے سی آئی اے کے پاس اس سے بہترین حل نہیں تھا کہ اس کے بچے کی قبل از وقت پیدائش عمل میں لائی جائے۔

اس کے بچے کی حالت اتنی اچھی تھی کہ وہ تین ہفتے پہلے پیدا ہونے پر بھی زندہ بچ سکتا تھا۔ اور نہ بچتا تو بھی سالار یا امامہ میں سے کوئی ورلڈ بینک یا سی آئی اے کا ہاتھ اس ساری صورت حال میں سے برآمد نہیں کر سکتا تھا۔

امامہ انجکشن لگوانے سے پہلے ہاسپٹل کے کمرے میں ہی پیڈی، جبریل اور عنایہ کو لے آئی تھی اس وقت بھی اس کا یہی خیال تھا کہ چند گھنٹوں میں وہ واپس گھر چلی جائے گی لیکن اسے پہلی بار تشویش تب ہوئی تھی جب اسے دردزہ ہونا شروع ہو گیا تھا اور ڈاکٹر نے اس کی تصدیق بھی کر دی تھی کہ انجکشن کے ری ایکشن میں شاید انہیں بچے کی زندگی بچانے کے لیے فوری طور پر دنیا میں لانا پڑے۔

وہ پہلا موقع تھا جب امامہ بری طرح پریشان ہوئی تھی وہاں کنشاسا میں گھر کے چند ملازموں کے علاوہ ان کا کوئی ایسا حلقہ احباب نہیں تھا جنہیں وہ ایسے کسی بحران میں مدد کے لیے پکارتے یا جن پر بھروسا کرتے۔ ان کا جتنا میل ملاپ تھا وہ سرکاری تھا اور غیر ملکی تھا۔

فوری طور پر امامہ کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا تھا کہ وہ بچوں کو کہاں بھیجے۔ اس کی ڈاکٹر نے اسے مدد کی پیش کش کی تھی کہ وہ بچوں کو اپنے گھر رکھ سکتی ہے لیکن امامہ کے لیے تو یہ ناممکن تھا۔ وہ اپنی اولاد کے بارے میں جنون کی حد تک محتاط تھی اور خاص طور پر جبریل کے حوالے سے۔ یہ غیر فطری نہیں تھا۔۔۔ اس نے ایک بھرے پرے خاندان سے نکل کر دس سال کی قید تنہائی کاٹی تھی اور پھر امید اور ناامیدی کے درمیان لٹکتے ہوئے اس نے ان خونی رشتوں کو پایا تھا۔۔۔ وہ اس کی کل کائنات تھے اور اسے اس وقت ملے تھے جب وسیم کی موت کے بعد وہ مایوسی کے سب سے بدترین دور سے گزر رہی تھی۔۔۔ جبریل اس کی زندگی میں اس وقت بہار کی طرح آیا تھا۔ اس کے وجود کے اندر پلتے ہوئے بھی اس نے ماں کو کسی مسیحا کی طرح سنبھالا تھا۔



READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

وہ پہلی بار جبریل کو دیکھنے اور گود میں لینے پر بلک بلک کر روئی تھی۔ لگتا تھا اولاد نہیں معجزہ تھا اس کے لیے۔۔۔ اور یقین یہ نہیں آرہا تھا کہ معجزہ اس کے لیے کیسے ہو گیا تھا۔

وہ اس کی وہ اولاد تھی جس نے اس کی زندگی کے بدترین دنوں میں سے کچھ دن' اس کے وجود کے اندر پلتے ہوئے اس کے کرب کو سہتے ہوئے گزارے تھے اور یہ وہ احساس تھا جو امامہ کو جبریل کے سامنے ہمیشہ شرمندہ بھی رکھتا تھا اور احسان مند بھی۔ سالار کہتا تھا وہ جبریل کی عاشق تھی اور وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اسے جبریل کے سامنے واقعی کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ عنایہ۔۔۔ سالار دونوں کہیں پیچھے چلے جاتے تھے۔۔۔ وہ اس پر بھروسا کرتی تھی اور چار سال کے اپنے اس بیٹے کو ہر جگہ اپنے ساتھ یوں رکھتی تھی جیسے وہ بہت بڑا ہو۔ جبریل عام بچوں جیسی عادات نہیں رکھتا تھا۔ ذہانت اسے باپ سے ورثے میں ملی تھی لیکن برداشت اس نے کہاں سے لی تھی؟ یہ امامہ نہیں جان پائی تھی۔ اس کے دونوں بچے ہی ضدی اور شرارتی نہیں تھے لیکن جبریل میں ایک عجیب سی سنجیدگی اور سمجھ داری تھی جو اس کے معصوم چہرے پر بلا کی سجتی تھی۔

وہ ہر چیز کا بے حد خاموشی سے مشاہدہ کرنے کا عادی تھا' بنا کوئی تبصرہ کیے۔۔۔ امامہ کون سی چیز کہاں رکھ کر بھولتی تھی یہ جبریل کو یاد رہتا تھا۔۔۔ وہ سالار سکندر کی عدم موجودگی میں اس گھر کا "بڑا" تھا۔۔۔ اور وہ جیسے اپنے اس کردار سے بخوبی واقف بھی تھا۔

ہسپتال میں امامہ اور ڈاکٹر کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو بھی اس کے سامنے ہی ہوتی رہی تھی اور وہ چپ چاپ بیٹھا سن اور دیکھ رہا تھا۔

امامہ کو اب بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کی ڈلیوری کم از کم تب تک ٹل جائے جب تک سالار امریکہ پہنچ جائے اور وہ اس سے بات کرلے اور اسے صورت حال سے آگاہ کردے۔۔۔ وہ اس کے اور بچوں کی فوری دیکھ بھال کے لیے تو کچھ کرتا ہی کرتا لیکن کم از کم وہ اس سے ڈلیوری سے پہلے ایک بار بات تو کرلیتی۔

وہ خوف جو ہمیشہ اسے اپنے حصار میں لیتا رہا تھا وہ اب بھی لے رہا تھا۔۔۔ اور کیا ہوا۔۔۔ اگر ڈلیوری کے دوران مرجائے تو۔۔۔ اور یہ وہ "تو" تھی جو اسے ہر بار آپریشن تھیٹر میں جاتے ہوئے سالار سے ایک بار معافی مانگنے پر مجبور کرتی تھی۔ اپنی احسان مندی جتانے پر بھی مجبور کرتی تھی لیکن بس زبان اگر ایک جملے پر آکر اٹکتی تھی تو وہ اس سے محبت کا اظہار تھا۔۔۔ وہ آج بھی سالار سے محبت کے اظہار کے لیے بس جملے اور لفظ ہی ڈھونڈتی رہ جاتی تھی۔ وہ لفظ اور وہ جملے جو اسے اتنے خالص' اتنے سچے لگتے کہ وہ سالار تک وہ جذبات پہنچا پاتی جو اس کے دل میں اپنے مرد کے لیے تھے۔ اللہ کے بعد جو بھی تھا اسی کے دم سے تھا۔ وہ حمین کی پیدائش سے پہلے موت کے خوف میں مبتلا ہوئی تھی۔۔۔ اور اس بار پہلے سے کئی گنا زیادہ کیونکہ سالار دور تھا۔۔۔ وہ تنہا تھی۔۔۔ اور اس کے بچے کم سن تھے۔

اس کی خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔ درد بڑھ رہا تھا اور ڈاکٹر اسے آپریشن تھیٹر میں لے جانا چاہتی تھی کیونکہ کیس نارمل نہیں تھا۔ اسے آپریشن کرنا تھا۔

امامہ نے پیڈی کو اپنے بچوں کی ذمہ داری سونپنے سے پہلے جبریل کو عنایہ کی ذمہ داری سونپی تھی۔ اسے بہن کا خیال رکھنے کا کہا تھا اور کبھی بھی اسے اکیلا نہ چھوڑنے کا کہا تھا۔ جبریل نے ہمیشہ کی طرح سر ہلایا تھا۔ فرماں برداری سے۔ یہ ذمہ داری اسے پہلی بار نہیں سونپی گئی تھی' ہمیشہ سونپی جاتی تھی۔۔۔ لان میں اکیلے کھیلتے ہوئے۔۔۔ کسی شاپنگ مال میں شاپنگ کے دوران' پرام میں بیٹھے۔۔۔ گاڑی میں اکیلے بیٹھے جب سالار کبھی کسی سروس اسٹیشن یا کسی اور جگہ اکیلا انہیں لے کر جاتا اور کچھ منٹوں کے لیے اتر کر کچھ لینے جاتا' جبریل خود بخود کمانڈ سنبھالنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔۔۔ اور عنایہ بھائی کی فرماں برداری کرتی رہتی تھی۔۔۔ ایک بار پھر جبریل کو ایک ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ ایک بار پھر اس نے ہمیشہ کی طرح ماں کو تسلی دی تھی۔



WWW.PAKSOCIETY.COM
READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY